جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

بیاد
محدثِ کبیر عالمِ ربّانی حضرۃ مولانا سیّد حامد میاںؒ

ماہنامہ

# انوارِ مدینہ

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ / مارچ 2011ء

- قیادت کی خصوصیات
- سجدۂ تلاوت ادا کرنے کا طریقہ اور اس سے متعلق کچھ اہم مسائل
- توہین رسالت کے مرتکب شخص کی توبہ
- کشکول
- مولانا الطاف حسین حالیؒ
- علمائے ہند کا سیاسی مؤقف

جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور

# حضور ﷺ میں ہوں ادنیٰ امیدواروں میں

**فاخرؔ جلال پوری**

دیارِ طیبہ کے صحرا میں، ریگ زاروں میں<br>
جو بات ہے وہ کہاں خلد کی بہاروں میں

یہ آرزو ہے جو مل جائے خاکِ پائے رسول ﷺ<br>
تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ہیں تاج داروں میں

اِک عہدِ خاص کی تاریخ ہوگئی ہے رقم<br>
مرے رسول ﷺ کی انگشت کے اشاروں میں

بس اِک نگاہِ کرم میرے حال پر ہو جائے<br>
حضور ﷺ میں ہوں اِک ادنیٰ امیدواروں میں

اگر نبی ﷺ کے غلاموں کی بھی غلامی کا<br>
شرف ملے تو ہم ہو جائیں شہر یاروں میں

بس اِک ذرۂ خاک درِ نبی ﷺ کے طفیل<br>
یہ کم نہیں کہ مرا ذکر ہے ستاروں میں

درِ رسول ﷺ پہ ہر ایک جانے والوں کے<br>
گناہ دُھلتے ہیں رحمت کے آبشاروں میں

یہ آرزو ہے کہ فاخرؔ کا نام لکھ اُٹھے<br>
حضورؐ صفحہ رحمت کے گوشواروں میں

( معارف جون ۲۰۰۹ء، ص:۴۷۸ )

علمی دینی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

لاہور

جلد نمبر: 3 | ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ / مارچ 2011ء | شمارہ نمبر: 9

**نگران**

حضرت اقدس مولانا **سید رشید میاں** دامت برکاتہم

**مدیر**

**مفتی محمد سعید خان**

**زرِ تعاون**

فی شمارہ: 30 روپے، ششماہی: 150 روپے، سالانہ: 300 روپے

**بیرون ملک**

امریکہ، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ

ویسٹ انڈیز، ناروے وغیرہ 30 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط

بحرین، ایران، عمان، انڈیا وغیرہ 25 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش 20 امریکی ڈالر

**مجلس مشاورت**

- مولانا شیر الرحمٰن
- مولانا حبیب اللہ اختر
- محمد اورنگ زیب اعوان
- کمپوزنگ: سہیل عباس

**رابطہ نمبر:** 0333-8383337 / 0333-8383336

پتہ برائے خط و کتابت و ترسیل زر

**دفتر ماہنامہ الحامد:** الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، مین مری روڈ، چھتر، اسلام آباد پاکستان 46001

مولانا نعیم الدین طابع و ناشر نے پرنٹ یارڈ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''الحامد'' لاہور سے شائع کیا

# فہرست مضامین

ادار یہ

# قیادت کی خصوصیات

**مدیر کے قلم سے**

کلام کا اثر انسان پر ہوتا ہے۔کوئی تعریف کرے تو خوشی ہوتی ہے اور کسی کی مذمت سے ناگواری پیدا ہوتی ہے۔لیکن اگر یہ غور کیا جائے کہ تعریف یا مذمت کون کر رہا ہے،تو پھر حقیقی صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔اگر کوئی کامل تعریف کرے تو یہ حسن قبول کی پہلی بشارت ہے، جو اس دنیا میں ہی دے دی گئی اور اگر کوئی کامل مذمت کرے تو اپنی اصلاح کا موقع ملتا ہے اور اگر یہ مدح و ذمہ عوامی سطح کی ہو تو بالکل لائق اعتنا نہیں ہے۔عوام آج جس کے ہاتھ چومتے ہیں، کل اُسے مارنے کے لیے اپنے ہاتھوں میں جوتے اُٹھا لیتے ہیں۔نہ اُن کی تعریف قربِ الٰہی میں اضافہ کرتی ہے اور نہ ہی ان کی مذمت سے اس قرب میں کمی واقع ہوتی ہے۔سو انسان اپنی تعلیم اور تزکیے میں مصروف رہے۔وہ علم کو اگر عمل کرنے کی غرض سے حاصل کر رہا ہے تو پھر ایسے شخص کی طبیعت میں وقت کے ساتھ ساتھ تواضع اور عاجزی جنم لیتی ہے اور اگر غرض کچھ اور ہے تو پھر یہ علم، غرور پیدا کرتا ہے۔مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

مذ عرفت الناس لم أفرح بمدحهم ، ولم أكره ذمّهم لأن حامدهم مفرط ،و ذامهم مفرط، إذا تعلم العالم العلم للعمل كسره، وإذا تعلمه لغير

جب مجھ پر لوگوں کی حقیقت کھلی ہے، اس وقت سے، میں نہ تو لوگوں کی تعریف سے خوش ہوتا ہوں اور نہ ہی ان کی مذمت سے ناراض ہوتا ہوں۔اس لیے کہ ان کی تعریف بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور ان کی مذمت بھی حد سے بڑھی ہوئی۔جب کوئی شخص علم، عمل کرنے کی غرض سے حاصل کرتا ہے تو وہ عمل اس میں کسر نفسی پیدا کرتا ہے اور اگر علم کسی دنیوی غرض

العمل ، زاده فخراً.

(سیر اعلام النبلاء ، ج:٥، ص:٣٦٢)

سے حاصل کیا جائے ،تو وہ بڑائی اور غرور پیدا کرتا ہے۔

اس کھوج میں رہنا کہ فلاں شخص کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ عوام کی نگاہ میں میری وقعت کیا ہے؟ یہ سب مخلوق پرستی ہے۔ اس سے بہت بلند تر ہو کر سوچے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم میرے بارے میں کیا ہے؟ وہ مجھے کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاں صاحب مرتبہ تو درکنار انسانوں اور پھر مسلمانوں میں بھی شمار ہوتا ہوں کہ نہیں۔ اسی لیے اہل نظر لوگوں کی تعریف کو مذمت سے زیادہ خطرناک اور ان کی مدح کو ہلاکت تصور کرتے تھے۔

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کہا:

یاخیرالناس أوابن خیر الناس

اے سب سے بہتر آدمی اور اس شخص کے صاحبزادے جو سب سے اچھا انسان تھا

تو انہوں نے فرمایا:

ولکني عبد من عباد الله، أرجو الله ، وأخافه،

والله لن تزالوا بالرجل حتی تهلکوه.

(سیر اعلام النبلاء ، ج:٣، ص:٢٣٦)

ایسی بات نہیں ہے بلکہ میں اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ اسی سے امید رکھتا ہوں اور اسی کا خوف ہے۔ اللہ کی قسم تم لوگ تو کسی شخص کی تعریف کرتے کرتے ، اس کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ حتی کہ اسے تباہ کر کے ہی چھوڑتے ہو۔

یہی وہ بے جا مدح وستائش ہے، جو انسان میں اپنی رائے پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ پھر وہ آدمی اپنی رائے کو حتمی اور حرف آخر سمجھتا ہے۔ دوسروں کی رائے کو کم عقلی پر مبنی جانتا ہے پھر اپنی کسی ادا یا کسی ایک آدھ جملے سے، اس رائے کی بے وقعتی لوگوں پر ظاہر بھی کر دیتا ہے اور اپنی رائے کو وزنی اور وقعت دار بھی۔

نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ کہ اس سے افراد اور جماعتوں میں پھوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔رقابت جنم لیتی ہے۔انتشار اور فساد پھیلتا ہے۔قوت اور طاقت کمزور پڑتی ہے اور آغاز کہاں سے ہوا تھا محض عوام کی بے جا تعریف پر پھول جانے اور مذمت پر بُرا منانے سے۔

اس لیے انسان کو چاہیے کہ حقائق کا ادراک کرے اور غبار کے چھٹنے کے بعد کی صورتحال کو حقیقت جانے۔رہنما وہ ہوتا ہے جو مستقبل کو حال کے آئینے میں دکھائے۔اس کے آج کے اندیشے کل کے حقائق ہوں اور اس کی آج کی خوشخبریاں کل کی تاریخ ہوں۔اس کی عقابی نگاہیں، مستقبل کی صورت حال کو اچک کر آج کی لوح پر ثبت کردیں۔ایسے رہنما عوام کی مدح و مذمت سے بلند تر ہوکر سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں۔انہیں لوگوں کو اپنے پیچھے چلانا ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ حالات اور عوام کا رویہ دیکھ کر خود ان کے پیچھے چل پڑیں۔

عوام کبھی نیکی میں تاخیر کر کے ٹھوکر کھاتے ہیں اور کبھی عجلت میں قائم کی گئی رائے پر شرمندہ ہوتے ہیں۔

اس لیے جو شخص عوام کے رجحان کو دیکھ کر اپنی پالیسی بناتا ہے، وہ خود ابھی سیکھ رہا ہے، استاد کب بنے گا؟

؎ کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے ، طاؤس فقط رنگ

☼......☼......☼

# درس قرآن مجید

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ.(۳۴)

اور جب ہم نے حکم دیا تمام فرشتوں کو سجدہ کرو آدم علیہ السلام کے سامنے تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، اس نے تعمیل حکم سے انکار کیا اور اپنے کو بڑا سمجھا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔

**تفسیر:** اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ تم سب آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور اس نے اپنے کو بڑا سمجھا اور متکبرانہ روش اختیار کی اور وہ کافروں میں سے ہوگیا۔

مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی بزرگی اور ان کی فضیلت کو ظاہر کرنے کی غرض سے حق تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو اور نیز جنات کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرو اور اس کی تعظیم بجالاؤ۔ چنانچہ سوائے ابلیس کے سب نے اس حکم کی تعمیل کی اور ابلیس نے صرف یہی نہیں کہ سجدہ نہیں کیا بلکہ غرور وتکبر کا اظہار کیا اور اپنے کو آدم علیہ السلام سے بہتر اور بالاتر سمجھ کر سجدہ نہیں کیا اور حضرت حق جل مجدہٗ کے حکم پر معترض ہوا اور اس کو غیر معقول سمجھا۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حکم تو صرف فرشتوں کو دیا گیا تھا اور شیطان تو ان میں داخل ہی نہیں تھا۔ کیونکہ شیطان تو جنات میں سے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم ملائکہ اور جنات دونوں کو

تھا۔جیسا کہ بعض محققین کا یہی قول ہےاور قرینہ بھی اسی کو مقتضی ہے۔کیونکہ یہ واقعہ آدم علیہ السلام کی فضیلت کے اظہار کا تھا۔

جب ملائکہ کو اس بزرگی کے اظہار کے لئے سجدے کا حکم دیا گیا تو جنات تو ان سے کہیں کم درجہ کی مخلوق ہیں ان کو کیوں نہ حکم دیا جاتا اور اسی وجہ سے صرف ملائکہ کا ذکر کیا گیا کیونکہ جنات کا اس حکم میں شامل ہونا بالکل ظاہر تھا اس لئے ان کا ذکر ترک کر دیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنات بھی ملائکہ کی ایک گھٹیا قسم ہوں جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ملائکہ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جن کے ہاں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہے اور انہیں کو جنات کہتے ہیں۔اگر یہ قول روایۃً صحیح ہو تب تو کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر یہ حکم صرف ملائکہ ہی کو دیا گیا ہو تب بھی ابلیس چونکہ اپنی نیکی اور کثرت عبادت کی وجہ سے ملائکہ ہی کے ساتھ رہتا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور ان کی فضیلت کے تذکروں میں شریک رہتا تھا۔اس لیے ابلیس بھی اس حکم میں شریک تھا جو حکم ملائکہ کو دیا گیا تھا۔جس طرح یہ شبہ صحیح نہیں ہے اسی طرح اس آیت سے غیر اللہ کے لئے سجدے کا استدلال کرنا بھی باطل اور لغو ہے۔

کیونکہ اوّل تو یہ متعین نہیں کہ یہ سجدہ حقیقتاً حضرت آدم علیہ السلام ہی کو تھا یا حضرت آدم علیہ السلام محض قبلہ تھے اور سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کو تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا سجدہ ہو اور آدم علیہ السلام اس شکر کے سجدے کا سبب ہوں۔پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کو کنایہ کے طور سجدے سے تعبیر کیا ہو۔ان تمام صورتوں میں غیر اللہ کے سجدے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر یہی معنی تسلیم کر لئے جائیں کہ یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کو تھا اور ان کے لئے تحیۃ اور تعظیم کی غرض سے کیا گیا تھا۔ تب بھی یہ حکم اس مخلوق کو دیا گیا تھا جس کے ساتھ ہمیں کوئی مناسبت نہیں اور نہ ہم ان کی باتوں کے مکلّف ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو کیا حکم دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمارے لئے کافی ہے۔ لو کنت امران یسجد لاحد لا مرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا یعنی اگر میں کسی کو

سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو یہ حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ یہ روایت صحیح ہے اور اس روایت کے اگر تمام طرق کو جمع کیا جائے تو بیس صحابہ رضی اللہ عنہم تک اس کا سلسلہ پہنچتا ہے۔ اس لیے بعض علماء اس کے متواتر ہونے کے قائل ہیں اور اس روایت کے مشہور ہونے میں تو شک ہی نہیں۔ لہذا اگر ملائکہ کے اس حکم کو عام بھی کر دیا جائے تو بھی یہ حدیث اس حکم کی ناسخ سمجھی جائے گی اس لئے کہ یہ ظنی الثبوت اور قطعی الدلالتہ روایت اس آیت کے حکم کو نسخ کرنے کے لئے کافی ہے جو آیت قطعی الثبوت اور ظنی الدلالتہ ہو۔ پھر اس حدیث کی تائید قرآن کی آیت سے بھی ہوتی ہے اللہ تعالی نے سورہ فصلت میں ارشاد فرمایا۔ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَ لَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَہُنَّ یعنی عالم علوی کے بڑے بڑے کرّے سورج اور چاند بھی اس قابل نہیں کہ تم ان کو سجدہ کرو۔ بلکہ تم صرف اس اللہ تعالی کو سجدہ کیا کرو جنہوں نے ان کو پیدا کیا ہے۔ قرآن اور حدیث اور اجماع اس امر کے لئے کافی ہے کہ سجدہ تعظیمی کو غیر خدا کے لئے حرام سمجھا جائے۔ یہاں اس بحث کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب زیادہ تحقیق کرنا چاہیں تو کتب فقہ کی طرف رجوع کریں۔ اور ابلیس کے متعلق یہ جو فرمایا کہ وہ کافر ہو گیا۔ اس کے بھی دو مطلب بیان کئے گئے ایک یہ کہ وہ کافر تھا یعنی علم الٰہی میں وہ پہلے ہی سے کافر تھا اور اب اس کا کفر ظاہر ہو گیا یا یہ کہ وہ ہمارے حکم کی تعمیل نہ کرنے اور ہمارے حکم کے مقابلے میں سرکشی کرنے سے کافر ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

| | |
|---|---|
| وَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ وَکُلَا مِنۡہَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ.(۳۵) | اور ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا اے آدم علیہ السلام سکونت اختیار کر تو اور تیری بیوی جنت میں اور تم دونوں اسمیں سے خوب جی بھر کر جہاں سے چاہو کھاؤ اور ہاں! دیکھو اس مخصوص درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ |

**تفسیر:** اور ہم نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو بسو اور جنت کی نعمتوں میں سے جہاں سے چاہو خوب اچھی طرح کھاؤ، مگر ہاں دیکھو اس فلاں درخت کے قریب نہ پھٹکنا ورنہ تم دونوں ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنے حق میں ظلم کرنے والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کی پسلی سے ان کی بیوی حوا کو پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی بیوی کے ہمراہ جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا اور جنت کی تمام نعمتیں اور وہاں کے پھل ان پر حلال کر دیئے گئے البتہ ایک خاص درخت کے قریب جانے کی ممانعت کر دی گئی اور قریب جانے سے مراد اس کے کھانے کی ممانعت تھی جیسے تاکید کے طور پر کہتے ہیں کہ اس چیز کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ یہ شجرِ ممنوعہ یا تو گیہوں تھا یا انگور کا درخت تھا یا ہو سکتا ہے کہ اور کوئی درخت ہو۔ بہر حال آدم علیہ السلام جنت میں رہنے لگے لیکن شیطان ان کی فکر میں پڑ گیا اور آدم علیہ السلام کی وجہ سے جو اس کی ذلت ہوئی تھی اس کا انتقام لینے کی فکر کرنے لگا۔ ادھر اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام اور حوا کو بھی اس کی اس کی دشمنی اور عداوت سے آگاہ کر دیا کہ دیکھو یہ تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے کہنے میں نہ آ جانا۔

۞......۞......۞

ہندوستان میں جس چیز کا نام دین ہے وہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے دیوبند کو منتقل ہوا۔ ندوہ بھی اس قبیلہ ہی کا ایک کنبہ ہے جس نے ادب کو جلا بخشی، دیوبند اور ندوہ کو برصغیر کے اسلامی ادب اور دینِ حنیف سے خارج کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہتا اور جو لوگ ان کی جگہ لینے کے لیے مضطرب ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تو تلوار بھی نیام ہو جاتی ہے۔

(قلم کے چراغ، آغا شورش کاشمیری، ص:۱۵۸، ۱۵۹)

# سجدۂ تلاوت ادا کرنے کا طریقہ اور اس سے متعلق کچھ اہم مسائل

**مفتی محمد سعید خان**

یہ بات تو آپ کے علم میں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس نے اپنے غرور اور تکبر کے نشے میں بہک کر اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے رسوا ہوا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عزت اور رحمت باری تعالیٰ سے محروم کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی عبادت میں سے جو عمل بہت زیادہ پسند ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے بندے اُسے سجدہ کریں۔ سجدہ کرنا، اس بے عیب ذات کی قربت، رحمت اور شفقت کو بندے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ سجدہ کرنے سے وہ خوش ہوتا ہے۔ بندے کے گناہ جھڑتے اور معاف ہوتے ہیں اور عمل میں بندگی کی یہ آخری حد ہے کہ کوئی بندہ اپنا چہرہ، ناک اور پیشانی سب زمین پر رکھ دے، مٹی میں ملا دے اور اس ذات کے پاک ہونے، اس کے بلند مرتبے اور ہر تعظیم کے مستحق ہونے کی گواہی دے۔ اپنی عاجزی کی آخری حد تک پہنچ جائے اور سجدہ کر کے، مقام بندگی کے شرف پر اپنی مہر ثبت کر دے۔ اسی لئے انسان کے سجدہ کرنے پر شیطان رو دیتا ہے اور اسے افسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اس عبادت (سجدے) سے انکار کر کے جہنم مول لے لی۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان جب (قرآن کریم کی تلاوت میں) آیت سجدہ پر پہنچ کر اسے پڑھتا اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان اس انسان سے دور بھاگ جاتا ہے اور روتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ہائے میری بربادی، (حضرت) آدم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے بیٹے کو سجدے کا حکم ملا، تو اس نے سجدہ کیا اور جنت پالی اور مجھے بھی سجدے کا حکم دیا

گیا تھا، میں نے انکار کر دیا اور اب میرے لیے جہنم ہے۔

شریعت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہم جب بھی تلاوت کریں اور قرآن کریم کی ان آیات کو پڑھیں جن میں سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ہم ضرور سجدہ کریں۔

(۱) قرآن حکیم میں کل چودہ آیات ایسی ہیں جو آیات سجدہ کہلاتی ہیں۔

(۲) ان آیات سجدہ کے مقام پر قرآن حکیم کے حاشیے پر اگرچہ لفظ ''السجدہ'' لکھا ہوتا ہے تاہم درج ذیل نقشے میں ان آیاتِ سجدہ کو مزید واضح کر کے لکھ دیا گیا ہے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت اور اس کا نمبر | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱ | ۹ | الاعراف : ۷ | اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ |
| ۲ | ۱۳ | الرعد : ۱۳ | وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿١٥﴾ |
| ۳ | ۱۴ | النحل : ۱۶ | وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٥٠﴾ |

(۱) چودہویں پارے میں سورت: النحل: ۱۶ کی ان دو آیات ۴۹ اور ۵۰ پر اہل علم کا اختلاف ہے کہ سجدہ کس آیت کی تلاوت سے واجب ہوتا ہے؟ آیت: ۴۹ کی تلاوت اور آخری لفظ "یستکبرون" پر یا پھر آیت: ۵۰ کی تلاوت اور اس کے آخری لفظ "یومرون" پر؟ حنفی فقہاء نے دونوں آیات کو پڑھنے کے بعد یعنی لفظ "یومرون" کی تلاوت کے بعد سجدے کو واجب قرار دیا ہے تاکہ اگر پہلی آیت: ۴۹ کے پڑھنے کے بعد سجدۂ تلاوت نہ کیا اور صرف ایک آیت کریمہ (آیت: ۵۰) بڑھا کر پڑھ لی اور پھر سجدۂ تلاوت کیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر سجدۂ تلاوت (آیت: ۵۰) "یومرون" پر واجب ہوتا ہے

اور سجدہ تلاوت (آیت:۴۹) پہلے کر لیا گیا تو سجدۂ تلاوت ادا بھی نہ ہوگا اور ترک سجدۂ تلاوت کی وجہ سے قاری گنہگار بھی ہوگا، سو احتیاط اسی میں ہے کہ دوسری آیت کریمہ (آیت:۵۰) کی تلاوت کے بعد ہی سجدہ کیا جائے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
| --- | --- | --- | --- |
| ٤ | ١٥ | بنی اسرائیل : ١٧ | قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة |

(۲) پندرہویں پارے کی اس سورت بنی اسرائیل کے آخر پر سجدۂ تلاوت کہاں واجب ہوتا ہے؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ کچھ حضرات کے مطابق آیت:۱۰۷ کے بعد اور کچھ حضرات کے نزدیک آیت:۱۰۹ کی تلاوت کے بعد اس لیے احتیاط یہاں بھی یہی ہے کہ سجدہ تلاوت آیت:۱۰۹ کے بعد کیا جائے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
| --- | --- | --- | --- |
| ٥ | ١٦ | مریم علیها السلام : ١٩ | اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدة |
| ٦ | ١٧ | الحج : ٢٢ | اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ﴿۱۸﴾ السجدة |

(۳) سورۂ الحج میں ایک سجدۂ تلاوت تو وہ ہے جو کہ آیت:۱۸ کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اور حنفی فقہاء

نے اسے ہی ضروری قرار دیا ہے۔ پھر اسی سورت کی آیت: ۷۷ میں بھی اللہ تعالیٰ نے رکوع اور سجدے کا تذکرہ فرمایا ہے اور حنفی فقہاء کے نزدیک اس آیت: ۷۷ میں سجدے سے مراد نماز ہے کیونکہ اس کے ساتھ رکوع کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت: ۷۷ کی تلاوت پر بھی سجدۂ تلاوت کرنے کے قائل ہیں۔ اسی لیے اس آیت کریمہ پر قرآن حکیم کے حاشیے کو دیکھیں تو وہاں پر یہ الفاظ تحریر شدہ ہیں "السجدة عند الامام الشافعي رحمة الله عليه" اس لیے اگر کوئی حنفی، شافعی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے اس موقع پر نماز کے علاوہ تلاوت کرتے ہوئے، سجدۂ تلاوت ادا کرے تو اس کا یہ سجدۂ تلاوت مستحب قرار پائے گا اور کرنے والے کو ثواب بھی ملے گا۔ یاد رہے کہ فرض نماز اور تراویح میں اس آیت: ۷۷ پر سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

(۴) اس آیت سجدہ: ۷۷ کے صرف ایک آیت کے بعد سورۂ حج مکمل ہو رہی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص نماز میں اس آیت سجدہ کے بعد صرف یہ آخری آیت پڑھ کر، شافعی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے، فرض نماز، نفل نماز یا نماز تراویح میں اپنے رکوع میں سجدے کی نیت کر لے تو اس کی طرف سے یہ سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا اور اسے ثواب ملے گا۔ امام اور مقتدی سب کے لیے ایک ہی حکم ہے۔

(۵) اگر امام صاحب نے فرض نماز یا نماز تراویح پڑھاتے ہوئے اس آیت سجدہ: ۷۷ کو پڑھا اور نماز کی اسی رکعت کے رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی تو اس امام اور تمام مقتدیوں کا سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔ اور اگر امام صاحب نے اس نماز کی اسی رکعت کے سجدے میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی تو پھر یہ سجدہ اُن امام صاحب اور پوری جماعت کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور سب کو ثواب ملے گا۔

(۶) اگر امام صاحب نے فرض نماز یا نماز تراویح میں اس آیت کی تلاوت کی لیکن نہ تو رکوع میں اور نہ ہی سجدے میں اس سجدۂ تلاوت کی نیت کی تو وہ بالکل گنہگار نہیں ہوگا کیونکہ یہ سجدۂ تلاوت واجب ہی نہیں ہے۔

(۷) اگر کسی مقتدی نے اس آیت کو اپنے امام صاحب سے سن کر اسی رکعت کے رکوع میں یا اسی رکعت کے

سجدے میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی تو اس کا یہ مستحب سجدہ ادا ہو جائے گا اور اسے ثواب بھی ملے گا۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
|---|---|---|---|
| ۷ | ۱۹ | الفرقان : ۲۵ | وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿۶۰﴾ |
| ۸ | ۱۹۔۲۰ | النمل : ۲۷ | اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۩ ﴿۲۶﴾ |

(۸) یہ انیسویں پارے کی آخری سورت، سورۂ نمل: ۲۷ کی آیات: ۲۵، ۲۶ ہیں۔ حضرت امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ، جو کہ علم قرأت کے بہت بڑے امام ہیں ان کے نزدیک سجدۂ تلاوت آیت: ۲۵ کے پڑھنے کے بعد واجب ہوتا ہے اور حنفی فقہاء رحمہم اللہ آیت: ۲۶ کی تلاوت کے بعد سجدۂ تلاوت کو واجب قرار دیتے ہیں اس لیے یہاں بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ آیت نمبر: ۲۶ کی تلاوت کے بعد ہی سجدۂ تلاوت کو ادا کیا جائے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
|---|---|---|---|
| ۹ | ۲۱ | السجدہ : ۳۲ | اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ﴿۱۵﴾ |
| ۱۰ | ۲۳ | ص : ۳۸ | قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ۩ ﴿۲۴﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ |

(۹) تئیسویں پارے کی اس آخری سورۂ ص میں ان دونوں آیات (۲۴، ۲۵) میں سے سجدے کی آیت

کون سی ہے۔ حنفی فقہاء میں سے امام فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۷۴۳ھ کا فتویٰ یہ ہے کہ آیت سجدہ: ۲۴ ہے اور اس کے لفظ اناب تک کی تلاوت سے سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن دیگر حنفی فقہاء کرام رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ نہیں ہے بلکہ وہ اس کے بعد کی آیت: ۲۵ کی تلاوت کے بعد سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ان آیات کا مضمون آیت: ۲۵ ہی پر مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ سجدۂ تلاوت، آیت: ۲۵ کی تلاوت کے بعد ہی ادا کیا جائے۔

(۱۰) سورۂ ص کے اس سجدے کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب یہ سجدۂ تلاوت ادا کیا جائے تو اس میں یہ دعا بھی مانگنی چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ بِھَا . اَللّٰھُمَّ حُطَّ عَنِّیْ بِھَا وِزْراً وَاحْدُثْ لِیْ بِھَا شُکْراً وَتَقَبَّلْھَا مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ سَجْدَتَهٗ.

ترجمہ: ''اے اللہ اس سجدہ کی وجہ سے مجھے بخش دیجیے، اے اللہ اس سجدے کی وجہ سے میرے گناہوں کے بوجھ کو مجھ سے ہٹا دیجیے اور اے اللہ! اس سجدے کی وجہ سے میرے شکر میں اضافہ پیدا فرما دے۔ اور اس سجدۂ تلاوت کو میری طرف سے ایسے ہی قبول فرما لیجیے جیسے کہ آپ نے اپنے بندے حضرت داؤد علیہ وعلٰی نبینا الصلاۃ والسلام کے سجدے کو قبول فرما لیا تھا۔''

اس دعا کی وجہ، وہ حدیث ہے جو طبرانی اور مسند ابی یعلٰی میں آئی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ جیسے کہ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوں اور اس درخت نے سورۂ ص کی تلاوت شروع کر دی پھر جب وہ آیت سجدہ پر پہنچا تو اُس نے سجدۂ تلاوت ادا کیا اور اس میں یہ دعا مانگی (وہی دعا جو مذکورہ بالا سطور میں تحریر کی گئی)۔ جب صبح ہوئی تو میں نے اپنا یہ خواب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا ابوسعید! کیا آپ نے

بھی سجدہ کیا تھا؟ عرض کیا کہ نہیں۔ تو ارشاد فرمایا ابوسعید! اس درخت سے زیادہ آپ کا حق بنتا تھا کہ آپ سجدۂ تلاوت ادا کرتے۔ پھر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص کی تلاوت کی اور جب اس سورت کا سجدۂ تلاوت ادا کیا تو اس سجدۂ تلاوت میں اِس دعا کو بھی مانگا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ خواب میں یہ دیکھا کہ وہ سورۂ ص تحریر فرمارہے ہیں اور جب انہوں نے اس سورت کی آیت سجدہ کو تحریر کیا تو ان کے قلم، دوات اور ہر چیز جو کہ وہاں پر موجود تھی، اُس نے بھی سجدۂ تلاوت ادا کیا۔

سو اس لیے سورۂ ص کی آیت سجدہ: ۲۵ کا سجدۂ تلاوت واجب بھی ہے اور پھر اس میں مستحب یہ بھی ہے کہ اس میں وہ دعا مانگی جائے جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱۱ | ۲۴۔۲۵ | حم ۔ السجدہ : ۴۱ | فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ۩ |

(۱۱) یہ سورہ حٰمٓ السجدہ :۴۱، پارہ نمبر:۲۴ کی آیت:۳۸، آیت سجدہ ہے۔

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں اس بات پر اختلاف تھا کہ سجدۂ تلاوت آیت:۳۷ کے آخری لفظ تـعبدون تک پڑھنے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے یا آیت نمبر:۳۸ کے آخری لفظ یسئمون تک پڑھنے سے؟ امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم، آیت نمبر:۳۷ کے آخری لفظ تـعبـدون پر سجدۂ تلاوت کرنا ضروری سمجھتے تھے اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہم آیت:۳۸ کے آخری لفظ یسئـمون پر سجدہ ضروری قرار دیتے تھے اور حنفی فقہاء رحمہم اللہ نے بھی اسی قول پر فتویٰ دیا ہے اور اس کی عقلی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر سجدۂ تلاوت

آیت:۳۷ پر واجب ہوا تھا اور پھر ہم نے صرف ایک آیت:۳۸ مزید پڑھ کر سجدۂ تلاوت ادا کیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ پر عمل ہو جاتا ہے اور اگر اس کے برعکس صرف آیت نمبر:۳۷ کو پڑھ کر سجدۂ تلاوت کیا جائے گا تو پھر جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک آیت:۳۸ کو پڑھ کر، سجدہ تلاوت ادا کرنے کا ہے۔اُن کے نزدیک سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوگا۔اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ سجدۂ تلاوت، آیت سجدہ:۳۸ کی تلاوت کے بعد ادا کیا جائے۔

| نمبر شمار | پارہ | سورت | آیت سجدہ اور اس کا نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱۲ | ۲۷ | النجم : ۵۳ | فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝۶۲ |
| ۱۳ | ۳۰ | الانشقاق : ۸۴ | فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۰ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ۝۲۱ |
| ۱۴ | ۳۰ | العلق : ۹۶ | كَلَّا ط لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹ |

(۱۲) اگر کوئی شخص سورۂ حج کا دوسرا سجدہ بھی کرنا چاہے تو یہ اس کے لیے مستحب ہے۔

(۱۳) سجدۂ تلاوت وضو کے بغیر جائز نہیں۔

(۱۴) دورانِ تلاوت جب بھی سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی جائے، فوراً سجدۂ تلاوت ادا کر لینا چاہیے۔

(۱۵) بغیر کسی وجہ کے سجدۂ تلاوت کی ادائیگی میں تاخیر مکروہ تنزیہی ہے۔

(۱۶) عین طلوعِ آفتاب، زوالِ آفتاب اور غروب آفتاب کے تین اوقات میں سجدۂ تلاوت ادا نہ کیا جائے تا کہ سورج کی پرستش کرنے والوں کی مشابہت سے بچا جا سکے۔

(۱۷) اگر یہ تلاوت کا سجدہ مکروہ وقت میں واجب ہوا ہے، جیسے کہ فجر یا عصر کی نماز کے بعد تو اس سجدے کو اُسی وقت ادا کر لینا چاہیے کیونکہ جیسے وقت میں وہ واجب ہوا ہے، ایسے ہی وقت میں وہ ادا بھی ہو جائے گا۔

(۱۸) سجدۂ تلاوت جب ایک مرتبہ واجب ہو جائے تو پھر وہ شخص زندگی میں جب بھی سجدۂ تلاوت ادا

کرے گا اس کا یہ سجدہ ''ادا'' ہی شمار ہوگا کیونکہ سجدۂ تلاوت کی ایسی کوئی ''قضا'' نہیں ہوتی جیسے کہ فرض نمازوں کی ''قضا'' ہوا کرتی ہے۔

(۱۹) قرآن حکیم پڑھنے یا سننے سے، جب بھی سجدۂ تلاوت واجب ہو اگر کوئی شخص کسی عذر کی وجہ سے اس وقت فوراً وہ سجدۂ تلاوت ادا نہ کر سکے تو پھر اسے چاہیے کہ کم سے کم یہ پڑھ لے۔

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ .

**ترجمہ:** ''ہم نے سنا اور ہم نے آپ کا حکم مانا اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ بے شک ہمیں آپ ہی کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

اور پھر جب بھی وقت ملے، نماز کے مباح وقت میں فوراً سجدہ تلاوت ادا کرے۔

(۲۰) کسی بھی نماز کے فوراً بعد لوگوں کے سامنے سجدۂ تلاوت ادا کرنا مکروہ ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ایسے کرے گا تو ڈر ہے کہ جو شخص بھی اسے دیکھے گا وہ کہیں اس کے سجدۂ تلاوت کو ایک مستقل سجدہ سمجھ کر، نمازوں کے بعد سجدہ کرنا اپنی عادت نہ بنا لے یا یہ کہ سجدۂ تلاوت کرنے والے کا یہ سجدہ فعل کم عقل لوگ بدعت کے طور پر اختیار نہ کر لیں، البتہ تنہائی میں یہ سجدۂ تلاوت جائز ہے۔

(۲۱) سجدۂ تلاوت کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی مرد یا عورت پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے تو اُسے چاہیے کہ

کھڑا ہو کر دل میں یہ نیت کر لے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے سجدۂ تلاوت ادا کرتا ہوں اور اگر دل میں نیت نہ کر سکے تو زبان سے یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے سجدۂ تلاوت کو ادا کرتا ہوں پھر ہاتھ اُٹھائے بغیر، صرف زبان سے یہ کہے اللّٰہ اکبر پھر جھکے اور سجدے میں چلا جائے۔ سجدے میں تین مرتبہ سبحن ربی الاعلیٰ پڑھے اور جو دعائیں احادیث میں آئی ہیں (نمبر:۳۹ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں) انہیں

پڑھے، پھر اللّٰہ اکبر کہہ کر سیدھا کھڑا ہو جائے، تو اس کا سجدۂ تلاوت مکمل طور پر سنت کے مطابق ادا ہو جائے گا۔

(۲۲) اگر کوئی شخص باوضو ہو اور سجدۂ تلاوت کی نیت کر کے صرف ایک سجدہ کر لے اور سجدے میں نہ ہی سبحن ربی الاعلیٰ پڑھے، نہ دعائیں مانگے حتیٰ کہ سجدے میں جاتے اور اٹھتے وقت دونوں مرتبہ اللّٰہ اکبر بھی نہ کہے تو بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔

(۲۳) سجدۂ تلاوت کے لیے قیام کرنا یعنی کھڑے ہو کر پھر سجدۂ تلاوت کے لیے جھکنا یہ قیام مستحب ہے۔

(۲۴) اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت کے لیے قیام نہ کرے اور بیٹھ کر یا بیٹھا ہوا ہو اور پھر وہیں سے سجدۂ تلاوت میں چلا جائے، تو یہ جائز ہے۔

(۲۵) سجدۂ تلاوت کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو جانا یہ دوسرا قیام بھی مستحب ہے۔ اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت سے اُٹھ کر بیٹھ جائے یا چل پڑے یا لیٹ جائے تو بھی اس کا سجدۂ تلاوت ادا ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت سے پہلے کا قیام اور بعد کا قیام دونوں مستحب ہیں۔

(۲۶) سجدۂ تلاوت میں جاتے وقت تکبیر (اللّٰہ اکبر) کہنا اور سجدہ تلاوت سے فارغ ہو کر اٹھتے وقت تکبیر کہنا یہ دونوں تکبیرات سنت ہیں۔

(۲۷) کوئی شخص سجدۂ تلاوت میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا بھول جائے یا جان بوجھ کر چھوڑ دے اور سجدے سے اُٹھتے وقت بھی تکبیر بھول جائے یا جان بوجھ کر چھوڑ دے تو بھی جب سجدہ کرے گا تو سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا خلاصہ یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کی دونوں تکبیرات سنت ہیں کوئی شخص ان دونوں تکبیرات کو بھول جائے یا جان بوجھ کر چھوڑ دے بحر حال سجدۂ تلاوت ہر طرح سے ادا ہو جائے گا۔

(۲۸) سجدۂ تلاوت سے پہلے جب تکبیر (اللہ اکبر) کہے تو دونوں ہاتھوں کو نہ اٹھائے۔

(۲۹) سجدۂ تلاوت سے اُٹھتے وقت جو تکبیر (اللہ اکبر) کہے تو اُٹھ کر کھڑے ہو جانا بہتر ہے۔

(۳۰) اس دوسری اور آخری تکبیر کے بعد نہ تو تشہد پڑھنا ہے اور نہ ہی سلام پھیرنا ہے، سجدۂ تلاوت ادا ہو گیا۔

(۳۱) پہلی تکبیر کہہ کر جوں ہی سجدے میں سر رکھا، سجدۂ تلاوت ادا ہو گیا۔ اس کے بعد کسی شخص کا وضو باقی نہ رہا تو بھی اس کا سجدۂ تلاوت ادا ہو گیا۔

(۳۲) سجدۂ تلاوت میں تسبیحات کا پڑھنا سنت ہے۔

(۳۳) سجدۂ تلاوت کرنے والے کو چاہیے کہ سجدۂ تلاوت میں تین مرتبہ سبحن ربی الاعلیٰ پڑھے۔

(۳۴) سجدہ میں پہنچ کر اگر کسی شخص نے ابھی تسبیحات نہیں پڑھی تھیں کہ اُس کا وضو باقی نہ رہا اور تسبیحات نہ پڑھ سکا تو بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو گیا۔

(۳۵) سجدۂ تلاوت جس شخص پر بھی فرض ہو جائے، خواہ وہ امام ہو یا اپنی تلاوت کر رہا ہو تو اس کو چاہیے کہ سجدۂ تلاوت میں تین مرتبہ تسبیح کے بعد سجدۂ تلاوت میں وہ دعا بھی مانگے جو مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سجدۂ تلاوت میں مانگا کرتے ہیں۔

سَجَدَ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ.

ترجمہ: ''میرے چہرے نے سجدہ کیا اس ذات کو جس نے اسے تخلیق کیا اور اس کی صورت بنائی۔ پھر اس ذات نے اپنی طاقت وقدرت سے اس صورت کو سماعت اور بصارت عطا کی سو کیا ہی برکت والی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات جو کہ سب سے اچھا پیدا کرنے والی ہے۔''

(باقی آئندہ شمارے میں)

# توہین رسالت کے مرتکب شخص کی توبہ

حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی

آسیہ مسیح کی طرف سے توہین رسالت مآب ﷺ کا ارتکاب (معاذ اللہ)، سیشن عدالت کی طرف سے سزا، گورنر پنجاب سلمان تاثیر کا آسیہ سے اظہار ہمدردی، ڈسٹرکٹ جیل شیخوپورہ میں ملاقات، دینی حلقوں کا احتجاج، سلمان تاثیر کا قتل، قانون توہین رسالت کے خاتمہ کے لیے شیریں رحمان کا قومی اسمبلی میں بل جمع کرانا، دینی جماعتوں کی طرف سے ''تحریک تحفظ ناموس رسالت'' کا آغاز کراچی اور لاہور سمیت پورے ملک میں احتجاجی مظاہرے، 31 دسمبر کو ملک بھر میں ہڑتال تحریک کی ''کامیابی''، 18 فروری کو اس کامیابی پر ''یوم تشکر''، شکرانہ کے نوافل کی ادائیگی، دینی جماعتوں کا مؤقف، حکومتی وضاحتیں، این، جی، اوز کا سرگرم عمل ہونا، اخبارات، رسائل، الیکٹرانک میڈیا، موافق، مخالف تمام آراء قوم کے سامنے ہیں۔

گذشتہ دنوں اسلامی نظریاتی کونسل حکومت پاکستان کی سالانہ رپورٹ (2003-04ء) پڑھنے کا موقع ملا، اس میں مفتی اعظم پاکستان، رئیس دارالعلوم کراچی، سابق ممبر اسلامی نظریاتی کونسل حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی کا اسی عنوان پر ایک تحقیقی مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ اس کا مطالعہ کیا۔

موجودہ حالات کے تناظر اور مضمون کی افادیت کے پیش نظر ہم اسے قارئین ''الحامد'' کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

## توہین رسالت کے سلسلہ میں مسلمان کا حکم:

یہ مسئلہ تو اتفاقی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شخص آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرے اور توہین رسالت کا مرتکب ہو جائے، تو اس سے وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اور جرم ثابت ہونے پر اس کو قتل کیا جائے گا، لیکن قتل کی یہ سزا حکومتِ وقت دے گی، عوام کو اس کا اختیار حاصل نہیں۔ یہ شق اجماعی ہے اور اس کے دلائل نہایت واضح ہیں اور خود یہ عمل آنحضرت ﷺ کے عمل سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں کئی ایسے بدبختوں کو موت کی سزا دی ہے، جن کے قصے کتبِ حدیث اور سیرت میں مشہور ہیں۔

**ا...... عن علی رضی اللہ عنہ : قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: من سب نبیا قتل ومن سب اصحابہ جلد** (الصارم المسلول، ص:۹۲)

**۲...... فی اکفار الملحدین للعلامۃ الکاشمیری رحمہ اللّٰہ تعالیٰ:**

**فی کتاب الخراج : اجمع المسلمون علی ان شاتمہ ﷺ کافر ومن شک فی عذابہ وکفرہ کفر "شفا"** (ص:۵۴)

اور اس کا یہ کفر "ارتداد" کے حکم میں ہوگا۔

**۳...... فی رسائل ابن عابدینؒ : الساب المسلم مرتد قطعاالخ**(ص:۳۱۹)

**۴......وفیھا: من سب النبی ﷺ او ابغضہ کان ذلک منہ ردۃ الخ** (ص:۳۲۵)

**۵...... وفی الدرالمختار: حکمہ حکم المرتد الخ** (۲۳۴/۴)

**۶...... وفی فتح الباری : ومن طریق الولید بن مسلم عن**

**الاوزاعی ومالک فی المسلم هی ردة الخ وغیر ذلک من الکتب الفقهیه.**

اور مرتد اگر مرد ہو اور وہ سچی توبہ نہ کرے، تو اس کی سزا بھی بحکمِ نصوص قتل ہی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔

## اس سلسلہ میں ذمی کا حکم:

توہین رسالت کا مذکورہ حکم مسلمان کے بارے میں اجماعی ہے، البتہ ''ذمی'' کے بارے میں معمولی سا اختلاف ہے اور توہین رسالت کا مسئلہ زیادہ تر چونکہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش آتا ہے، اس لیے اس کا خلاصہ ''الصارم المسلول'' سے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱...... امام مالک، اہلِ مدینہ، امام احمد بن حنبل، فقہاءِ حدیث، خود امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذمی کو بھی مسلمان کی طرح توہینِ رسالت کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔

۲...... امام شافعیؒ کے اصحاب کے اس میں مختلف اقوال ہیں، جہاں تک امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے، تو وہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے، اور وہ یہ کہ توہینِ رسالت کا مرتکب اگر ذمی ہے، تو پہلی دفعہ میں اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ امام اس پر مناسب تعزیز جاری کرے گا، البتہ اگر وہ اس جرم کا ارتکاب مکرر کرے، تو اس صورت میں اس کو قتل کیا جائے گا۔

عربی عبارات درج ذیل ہیں:

**۷...... وتحریر القول فیه ان الساب ان کان مسلما فانه یکفر**

ویقتل بغیر خلاف وھو مذھب الائمة الاربعة وغیرھم وقد تقدم ممن حکی الاجماع علی ذلک اسحاق بن راھویة وغیرہ وان کان ذمیا فانه یقتل ایضا فی مذھب مالک واھل المدینة وسیأتی حکایة الفاظھم وھو مذھب احمد وفقھاء الحدیث واما الشافعی فالمنصوص عنه نفسه ان عھدہ ینتقض بسب النبی ﷺ وانه یقتل ھکذا حکاہ ابن المنذر والخطابی وغیر ھما.

واما ابوحنیفة واصحابه فقالوا: لا ینتقض العھد بالسب ولا یقتل الذمی بذلک لکن یعزر علی اظھارہ ذلک کما یعزر علی اظھار المنکرات التی لیس لھم فعلھا من اظھار اصواتھم بکتابھم ونحو ذلک وحکاہ الطحاوی عن الثوری ومن اصولھم ان مالا قتل فیه عندھم مثل القتل بالمثقل والجماع فی غیر القبل اذا تکرر فللامام ان یقتل ...... لھذا افتی اکثرھم بقتل من سب النبی ﷺ من اھل الذمة وان اسلم بعد اخذہ، وقالوا : یقتل سیاسة الخ (ص:۳ تا ۱۱)

## مسلمان مرتکب توہین کی توبہ کا حکم:

اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ توہین رسالت کے مرتکب شخص کی توبہ قابلِ قبول ہے یا نہیں؟ اوراس توبہ سے اس کے قتل کی سزا معاف ہوجائے گی، یا نہیں؟ اگر قابل قبول ہے، تو کب؟ اورتوبہ کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کو''استتابہ'' کہتے ہیں۔

اس میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف اس بات پر مبنی ہے کہ اس شخص کا قتل ''حداً'' ہے یا ''ردۃً'' ہے،

چنانچہ جو حضرات کہتے ہیں، اس کا قتل ردۃ ہے، وہ استتابہ کے قائل ہیں، اور جو حضرات کہتے ہیں کہ اس کا قتل حداً ہے، ان کے نزدیک اس میں عفو کی کوئی صورت نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شخص سچی توبہ کرے، تو توبہ کرنے سے اس کا آخرت کا معاملہ سدھر جائے گا، البتہ دنیا میں اس کی سزائے قتل ساقط نہیں ہوگی، خواہ وہ گرفتاری سے قبل ہو، یا گرفتاری کے بعد ہو، کیونکہ حد ثابت ہونے کے بعد ساقط نہیں ہوتی، اور نہ ہی کوئی اس کو معاف کرسکتا ہے، چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے:

**۸...... لاینبغی لوال ان یؤتی بحد الا اقامه (مصنف عبدالرزاق وغیرہ: ۷/ ۳۷۰)**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی صراحۃً منقول ہے:

**۹......لا عفو فی الحدود عن شئی منها بعد ان تبلغ الامام**

**۱۰...... فی اکفار الملحدین : فی قبول التوبة فی احکام الدنیا اختلاف وتقبل فیما بینه وبین اللّٰه تعالیٰ الخ (ص:۵۴)**

**۱۱...... فی رسائل ابن عابدین : وممن قال ذلک مالک بن انس واللیث واحمد واسحاق وهؤ مقتضی قول ابی بکر رضی اللہ عنہ ولاتقبل توبته عند هو لاء وبمثله قال ابو حنیفة واصحابه والثوری واهل الکوفة والا وزاعی فی المسلم لکنهم قالوا : هی ردة الخ .**

**۱۲...... وفیها: وقال فی محل آخر قال ابوحنیفة واصحابه : من برئی من محمد او کذب به فهو مرتدحلال الدم الاان یر جع الخ**

**۱۳......وفیها:وبعد فاعلم ان مشهور مذهب مالک واصحابه**

وقول السلف وجمهور العلماء قتله حداً لا كفراً ان اظهر التوبة منه ولهذا لاتقبل توبته ولا تنفعه استقالته وحكمه حكم الزنديق ، سواء كانت توبته بعد القدرة عليه الشهادة على قوله اوجاء تائبا من قبل نفسه لانه حدوجب لاتسقطه التوبة كسائر الحدود، قال القابسی : اذا اقر بالسب وتاب منه اظهر التوبة قتل بالسب لانه هو حد، وقال محمد بن ابی زيد مثله وامام بينه وبين اللّٰہ تعالیٰ فتوبته تنفعه ، وقال ابن سحنون : من شتم النبی ﷺ من الموحدين ثم تاب لم تزل توبته عنه القتل.

۱۴ ...... وفيها بعد التفصيل الطويل : اقول : فقد تحرر من ذلک بشهادة هؤلاء العدول الثقات المؤتمين ان مذهب ابی حنيفة قبول التوبة كمذهب الشافعی ، وفی الصارم المسلول لشيخ الاسلام ابن تيميه قال : وكذلک ذكر جماعة آخرون من اصحابنا انه يقتل ساب النبی ﷺ ولا تقبل توبته سواء كان مسلما او كافرا عامة هؤلاء لماذكروا المسئلة قالوا: خلافا لابی حنيفة والشافعی وقولهما ای ابی حنيفة والشافعی : ان كان مسلما يستتاب فان تاب والا قتل كالمرتد وان كا ن ذميا الخ .

۱۵ ...... وفيها : وقال ابو يوسفؒ وايما رجل مسلم سب رسول اللّٰہ ﷺ او كذبه او عابه او تنقصه فقد كفر باللّٰہ تعالیٰ وبانت منه امرأته فان تاب والا قتل وكذلک المرأة الا ان ابا حنيفة قال:لا

تقتل المرأة علی الاسلام انتهی بلفظه وحروفه الخ (مأخوذه من رسالة تنبيه الولاة والحكام علی احكام شاتم خير الانام المتضمنة لرسائل بن عابدين رحمه الله)

۱۶ ...... وفی الشرح الصغير للدرديرا: (وقتل الزنديق) بعد الاطلاع عليه بلا استتابة وهو من اسر الكفر واظهر الاسلام وكان يمسی فی زمن النبی ﷺ منافقاً (بلا قبول توبة) من حيث قتله، ولا بد من توبته لكن ان تاب قتل حدا والا كفرا (الا ان يجيئ) قبل الاطلاع عليه فلا يقتل ...... كالساب للنبی مجمع عليه فيقتل بدون استتابة ولا تقبل توبته ثم ان تاب قتل حدا ولا يعذر بجهل لانه لا يعذر احد فی الكفر بالجهل (او لسكر) حراما (اوتهور) كثرة الكلام بدون ضبط ولا يقبل منه سبق اللسان او غيظ (او بقوله: اردت كذا)الخ .(۴/ ۴۳۸)

وفی استتابة المسلم خلاف هل يستتاب فان تاب ترك والاقتل، او يقتل لوتاب والراجع الاول،

وفی حاشية علی الشرحِ الصغير للصاوی: (قوله: والراجع الاول) ای قبول التوبة كما هو مذهب الشافعی الخ (۴/ ۴۴۰).

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ شافعیہ اور حنفیہ کے ہاں اس کی توبہ قبول ہے اور اس کی وجہ سے اس سے قتل کی سزا ساقط ہو جائے گی اور امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے نزدیک اس کی توبہ دنیا کے حق میں قبول نہیں ہوگی اور توبہ کی وجہ سے اس کی

سزا قتل ساقط نہیں ہوگی۔

امام مالک اور ان کے اصحاب کا مذہب مشہور یہی نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ عبارت نمبر ۱۳ سے واضح ہے لیکن مالکیہ کی مشہور کتاب الشرح الصغیر اور اس کے حاشیہ میں ترجیح قبول توبہ کو دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو عبارت نمبر ۱۶۔

البتہ بزازیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کے ہاں بھی اس کو حد کے طور پر قتل کیا جائے گا اور بزازیہ کی اتباع میں متأخرین حنفیہ نے بھی اس قول کو ذکر کیا ہے، لیکن علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت تردید کی ہے اور اس کو غلط فہمی قرار دیا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں اس قول پر اعتماد نہ کیا جائے، چنانچہ ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

**۱۷ ...... فی الشامیة بعد بحث طویل یرد علی البزازیة : فقد علم ان البزازی قد تساهل غایة التساهل فی نقل هذه المسئلة ولیته حیث لم ینقلها عن احد من اهل مذهبنا بل استند الی مافی الشفاء والصارم امعن النظر فی المراجعة حی یری ماهو صریح فی خلاف ما فهمه ممن نقل المسئلة عنهم ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم فلقد صار هذا التساهل سببا لو قوع عامة المتاخرین عنه فی الخطاء حیث اعتمدوا علی نقله وقلدوه فی ذلک ولم ینقل احد منهم المسئلة عن کتاب من الکتب الحنفیة بل المنقول قبل حدوث هذا القول من البزازی فی کتبنا وکتب غیر نا خلافة (۲۳۴/۴) کذا فی شرح عقود رسم المفتی لابن عابدین (ص: ۳۲)**

## ذمی مرتکبِ توہین کی توبہ کا حکم:

اس میں تین اقوال مشہور ہیں:

۱......ذمی کو بہر حال قتل کیا جائے گا، اگر چہ گرفتاری کے بعد، توبہ بھی کر لے۔ یہ امام احمد اور امام مالک کا مشہور مؤقف ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔

۲......ذمی اگر توبہ کرے اور توبہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہو جائے، تو اس کی یہ توبہ قبول کی جائے گی۔ یہ امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ سے ظاہر الروایہ ہے۔

۳......ذمی کو قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ یا تو اسلام لے آئے یا حقیقی ذمی بن جائے اور اسی پر امام شافعی کا ظاہر کلام دلالت کرتا ہے۔ (خلاصہ مأخوذہ از الصارم المسلول، ص: ۳۳۰)

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ استتابہ کے مسئلہ میں آئمہ مجتہدین کا اختلاف ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور مالکیہ کے راجح قول کے مطابق مسلمان کی توبہ قابلِ قبول ہے اور امام احمد بن حنبل اور خود امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی توبہ قابلِ قبول نہیں اور ذمی کی توبہ کے بارے میں مذکورہ بالا تین اقوال ہیں، اس لیے زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق حکومت وقت ان دو میں سے کسی بھی مؤقف کے مطابق قانون بنا سکتی ہے، لیکن شان رسالت اور ناموس رسالت کی انتہائی عظمت اور جلالت شان کا تحفظ بہر حال انتہائی ضروری ہے اور اگر قانون میں توبہ کی گنجائش نکالی گئی، تو توبہ کا وہی طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا، جو اس سنگین ترین جرم کے مطابق ہو، جس کا طریقہ درج ذیل ہے:

## توبہ کا طریقہ:

(۱) مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے کہ توہین رسالت کا مرتکب شخص

بالاتفاق دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا ہے، لہٰذا توبہ کی صورت میں اس کے لیے سربرآوردہ علماء عوام کے مجمع میں فوراً تجدید ایمان کرنی لازم ہوگی، اوراس کا اسی قدر اعلان ہوگا، جس قدر ان حرکتوں کا اعلان ہو چکا تھا۔

(۲) چونکہ کافر ہونے کی وجہ سے اس کا نکاح ختم ہو چکا تھا، اس لیے اسلام لاتے ہی فوراً نکاح کی تجدید کرنی لازم ہوگی اوراس کا اعلان بھی اسی طرح ہوگا، جس طرح تجدید ایمان کا اعلان کیا تھا۔

(۳) یہ شخص گزشتہ جرم پر انتہائی شرمندہ رہے گا۔

(۴) اس وقت انتہائی عاجزی اور گریہ وزاری سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔

(۵) آئندہ کے لیے ان سب باتوں کے نہ کرنے کا پختہ عہد کرے۔

(۶) توہین رسالت پر مشتمل مواد اگر کتاب اور تحریری شکل میں ہو، تو اس صورت میں اس کے سارے موجود نسخے جلائے اور جہاں جہاں یہ کتاب یا رسالہ پہنچا ہے، ہر ممکن طریقہ سے وہاں سے اس کو ختم کرانے کی کوشش کرے، اخبارات کے ذریعہ اس کا عام اعلان کرے کہ میں اس کتاب یا رسالہ سے برأت کا مکمل طریقہ سے اعلان کرتا ہوں، لہٰذا اس کتاب کو جلایا جائے، یا کم از کم اس سے میرے نام کا ورق جلایا جائے۔

## کونسل کے زیرِ غور مسئلہ کی صحیح صورت حال کیا ہے؟

توہین رسالت کے جرم کے بارے میں قانون، انصاف اور انسانی حقوق ڈویژن کی دفتری یادداشت نمبر ۲/۱۶۱۹/۰۰۲۔لاء(۱) مؤرخہ ۲۵/اپریل ۲۰۰۳ء کے ذریعہ موصول ہونے والی وزارتِ خارجہ کی سمری

میں وزارتِ امور خارجہ نے اپنے طور پر اس تجویز پر صدر سے سفارش کی کہ ''اگر عدالت عالیہ پنجاب اور عدالت عظمیٰ اپنا فیصلہ برقرار رکھتی ہے اور ڈاکٹر یونس بذریعہ اقرار نامہ یہ بیان دیتا ہے کہ اس کا توہین رسالت کا ارتکاب کا کبھی ارادہ نہیں تھا، تو صدر، ڈاکٹر یونس شیخ کو از راہِ مہربانی معافی دے سکتے ہیں۔''

اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ مرتکبِ توہین رسالت کا یہ اقرار کرنا کہ اس کا ارادہ توہین رسالت کے ارتکاب کا کبھی نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا، یہ شرعی نقطہ نظر سے توبہ ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تو ارتکاب جرم کا انکار ہے، اور اپنی غلطی تسلیم نہ کرنے پر اصرار ہے کہ ایک آدمی ایسا جملہ استعمال کرے، جس سے شان رسالت کی توہین ہوتی ہو اور پھر کہے کہ میرا ارادہ اس سے توہین رسالت کا نہیں تھا، لہٰذا اس بنیاد پر اس کو کسی بھی مذہب کے مطابق معاف نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ توہینِ رسالت کا مسئلہ بہت ہی سنگین مسئلہ ہے، اس میں فقہاء کرام نے قصد، ارادہ، مذاق، بلکہ نشہ کی حالت میں بھی اگر کوئی اس طرح کوئی کلمہ منہ سے نکالے جس سے صراحۃً توہین رسالت ثابت ہوتی ہو، تو اس کو قتل کیا جائے گا، چنانچہ درج ذیل عبارات پر غور فرمائیں:

**۱۸...... فی الشرح الصغیر للدردیر : ولا یعذر بجهل لانه لا یعذر احد فی الکفر بالجهل** (اوالسکر) **حراما** (اوتهور) **کثرة الکلام بدون ضبط ولا یقبل منه سبق اللسان او غیظ** (او بقوله: اردت کذا)**الخ.** (۴/ ۴۳۹)

**۱۹...... وفی خلاصة الفتاویٰ عن المحیط: من شتم النبی** ﷺ **واهانه او عابه فی امر دینه او شخصه او وصف من اوصاف ذاته سواء کان الشاتم مثلا من امته او غیرها وسواء کان من اهل الکتاب او غیره ذمیا کان او حربیا ، سواء کان الشتم اوالاهانة**

**او العیب صادرا عنه عمدا او سهوا او غفلة او جدا او هز لافقد کفر خلودا الخ** (۶/۳۸۶)

(محمد رفیع عثمانی)
رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی
۱۴۲۴/۶/۲۸ھ
۲۷/اگست ۲۰۰۳ء

## گمان کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے گا

"وحتي تحزن ذوات الاولاد اي لحقوق اولادهن وتفرح العواقر ويظهر البغي والحسد والشح ويهلك الناس ويكثر الكذب ويقل الصدق وحتي تختلف الامور بين الناس ويتبع الهوي ويقضي بالظن"

''اور قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ صاحب اولاد اپنی اولاد کی نافرمانی کی وجہ سے غمگین ہوں گے، اور بے اولاد لوگ خوش ہوں گے، بغاوت، حسد، بخل ظاہر ہوں گے، لوگ ہلاک ہوں گے، جھوٹ میں اضافہ ہوگا، سچائی کی کمی ہوگی، لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوجائے گا، نفسانی خواہشات کی پیروی کی جائے گی، گمان کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے گا۔''

(الاشاعة، ص:۷۴، بحوالہ:فتنوں کا عروج اور قیامت کے آثار، ص:۷۹)

# کشکول

مفتی محمد سعید خان

## علماء کے لیے دعوت فکر

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو حقیقی طور سے علم کے جویا اور عمل کے رسیا تھے، "مخدوم الملة" کا لقب ان پہ سجتا تھا اور عبائے خلافت اشرفیہ ان پر سجتی تھی، کی ایک موثر اور پر مغز تحریر، علماء کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔ جن جن حضرات پر علم کی تہمت ہے اگر اُن کا عمل اِس تحریر کے مطابق ہو جائے تو اصلاح معاشرہ کا کام کتنے احسن طریقے سے انجام پا سکے۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ "معارف" میں لکھتے ہیں:

اس سلسلہ میں ہم کو بعض تلخ حقیقتوں کا بھی اعتراف کرنا ہے کہ علماء کی جماعت میں ایسے افراد تمام دوسری جماعتوں کے افراد سے زیادہ ہیں، جنہوں نے محض اپنے طرۂ دستار کی بلندی کو اپنے وقار و عظمت کا معیار ٹھہرا لیا ہے، وہ نیچے سے لے کر اونچے تک ہر ایک سے اس کے متوقع ہیں کہ ان کی محض ان کے علم کی خاطر تعظیم کرے، حالانکہ علم بلا عمل نہ دین میں عزت کی چیز ہے، نہ دنیا میں، ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا کہ جو مخدوم بنا ہے، وہ پہلے خادم ہوا ہے، پرانا مقولہ ہے،

ہر کہ خدمت کرد مخدوم شد

علماء اگر مخدوم بننا چاہتے ہیں، تو پہلے ان کو خلوص دل کے ساتھ اُمت کا خادم بننا چاہیے، تعلیم کی اشاعت، علم کی خدمت، دین کی تبلیغ، اخلاق کی تعلیم، عوام کی مدد، بگڑوں کا بنانا، گرتوں کو سنبھالنا،

غریبوں کی پستی، امیروں کی درستی، گمراہوں کی رہ نمائی، اور بیکسوں کی دست گیری، ان کا فرض ہو، اپنا کھانا نہیں، بلکہ بھوکوں کا کھلانا، اپنا پہننا نہیں، بلکہ ننگوں کو پہنانا، اپنی فکر نہیں، بلکہ دوسروں کے غم، ان کے ہر روز کا کام ہو، یہ ہے دین و دنیا میں ان کے وقار و عظمت کا اصل معیار۔

شبان وادی ایمن گہے رسد بمراد　　　　که چند سال بجاں خدمت شعیبؑ کند

ہم کو سوچنا چاہیے کہ ہم نے مسلمانوں کی کتنی تعلیمی گاہیں بنائیں، کتنے شفاخانے قائم کرائے، کتنی مسجدیں آباد کرائیں، کتنے شرابیوں کو پرہیز گار اور کتنے بدکاروں کو نیکوکار بنایا، کتنے غریبوں کی امداد کی، کتنے امیروں کو ان کی غلط کاریوں پر ٹوکا، کتنے بیماروں کی خدمت کی، کتنے گمراہوں کی ہدایت کی، کتنے مسرفوں اور فضول خرچوں کو معتدل اور انجام بیں بنایا، اور کتنے بخیلوں کو سخاوت اور فیاضی کی تعلیم دی، مسلمانوں کو اِس دنیا میں اور اُس دنیا میں کامیاب اور خوش حال بنانے کی کیا کیا کوششیں کیں؟

علماء کی ناکامیوں اور بدنامیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اور اپنے اہل وعیال کی پرورش کا ذریعہ اپنی مولویت کو قرار دیا اور اس کو حصولِ رزق کا پیشہ بنایا، حالانکہ ہم سے زیادہ وہ جانتے ہیں کہ علمائے سلف نے ہمیشہ اس کو احتیاط وتقویٰ کے خلاف سمجھا، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہر تحریک میں اس پر نظر رکھتے ہیں، کہ اس سے ہمارے اس اعزاز وجاہ پر کیا اثر پڑے گا، جو ہمارے کسب زر کا ذریعہ ہے، حالانکہ اس یقین میں کوئی شک نہیں، کہ جہاں اپنی غرض آئی، اخلاص رخصت ہوگیا، اور جہاں اخلاص گیا، کامیابی کوسوں دور ہوگئی۔

جدید تعلیم کی غرض نہ اخلاقی ہے نہ روحانی، اور نہ اس سے بلند معیار کی توقع کی جاسکتی ہے، ابھی حال میں خود انگریز حاکم اعلیٰ اور سرپی، سی رائے نے ان کے نقائص پر جو تقریریں کی ہیں، وہ اخبار بیں طبقہ سے پوشیدہ نہیں، اس حالت میں قوم کی اخلاقی وروحانی وتعلیمی تعمیر کے وہ نہ مخاطب ہیں نہ اہل ہیں، ان کا منتہائے نظر صرف عہدہ اور منصب ہے، اور جو کچھ وہ اضطراراً کرتے ہیں، وہ صرف اسی کے لیے، مگر

علماء اس حکومت میں نہ عہدہ کے اہل ہیں اور نہ منصب کے مستحق، اس لیے اگر وہ ذرا بلند ہمتی، استغنا اور اخلاص کے ساتھ کام کریں، تو ان کی دنیاوی ہردلعزیزی کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

(''معارف'' ماہ جنوری ۱۹۳۰ء، شذراتِ سلیمانی، حصہ دوم، ص:۲۶۹-۲۷۰، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یو۔پی)

## حسن سماعت

حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مجد الدین ابوالبرکات عبدالسلام بن عبداللہ بن تیمیہ الحرانی الحنبلی المتوفی ۶۵۳ھ کے متعلق حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل طبقات الحنابلہ میں تصریح کی ہے۔ وہ اپنے وقت کے امام، مفسر، محدث، نحوی اور فقہ حنبلی کے فقیہ دوراں تھے۔ کسی حال میں بھی وقت ضائع کرنا، ان پر سخت گراں گذرتا تھا حتی کہ انہوں نے اپنی ذہانت سے اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا کہ انسان جتنا بھی وقت بیت الخلا میں گزارتا ہے، وہ بھی ضائع نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ اپنے بیٹے عبدالحلیم بن تیمیہ (والد شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہم اللہ) کو کوئی کتاب دے کر بیت الخلاء کے دروازے پر کھڑا کردیتے اور فرماتے اس کتاب کو بلند آواز سے پڑھو میں جتنا وقت بھی اندر رہوں گا، اس کتاب کو سُن لوں گا۔[1]

☼......☼......☼

---

[1] كان الجد اذا دخل الخلاء يقول لي: اقرأ في هذا الكتاب، وارفع صوتك حتى أسمع.

الذيل على طبقات الحنابله، وفيات المائة السابعة، رقم الحديث: ۳۵۹، ج:۲، ص ۲۰۳.

# مولانا الطاف حسین حالی رحمۃ اللہ علیہ

بابائے اُردو مولوی عبدالحق

سر سید تو خیر اس زمانے میں موردِ لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس وناکس اُن پر منہ آتا تھا۔لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالیؔ تھے۔ایک تو وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خان سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا۔اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور مقدمۂ شعر وشاعری نے تو خاصی آگ لگادی۔اہلِ لکھنؤ اس معاملہ میں چھوئی موئی سے کم نہیں۔وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔انہیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انہیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔اودھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا۔جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب نمونہ تھا۔وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑّ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی، جن مضامین کا عنوان

ے ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

ہو تو اس سے سمجھ لیجیئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

ے کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے اُن کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب وغریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو، وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا، لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں اُن کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے، یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے ورنہ جوش میں آکر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا یہ ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صرع کی بیماری میں مبتلا تھا۔ اس لیے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اُف تک نہ کرتے، وہ اینڈے بینڈے سوال کرتا، یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے وہ فضول فرمائشیں کرتا، یہ اس کی تعمیل کرتے، وہ خفا ہوتا اور بگڑتا یہ اسکی دل دہی کرتے، وہ روٹھ جاتا یہ اسے مناتے، وہ لڑ کر گھر سے بھاگ جاتا، یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے، تو وہ انہیں دھمکی کے خط لکھتا۔ یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بُجھاتے، کچھ اس کی بیماری کا خیال اور کچھ اس کی دُکھیا ماں کا پاس۔ وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہَٹ، خفگی رُوٹھنے، مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگرچہ وہ جوان ہوگیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا سا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ مولوی صاحب

اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت کرنی موقوف کردی۔اور جب تک انہوں نے اس لڑکے سے معافی نہ مانگی،ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیا، جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔جس حالت میں تھے اُس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انہیں عربک اسکول میں ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انہوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے۔

ریاست حیدرآباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں، وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا۔مگر انہوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس کے لیے وہ بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سِوا ایک آدھ کے انہوں نے کبھی اپنی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی، جس نے چاہا چھاپ لی ان کی تصانیف مال یغما تھیں۔مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروّت کے پُتلے تھے۔جب تک خاص مجبوری نہ ہوتی کسی کی درخواست ردّ نہیں کرتے تھے۔وقت بے وقت لوگ آجاتے،اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے وہ بیٹھے سنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اُٹھ کر چلے جاتے یا کنایۃً اشارۃً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اُٹھ جاتے۔ حیدرآباد کے قیام میں میں نے اس کا تماشا خوب دیکھا۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔جس سال حیدرآباد تشریف لائے،سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انہیں کی موجودگی میں ہوا اُن سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کی لیے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔نواب عماد الملک صدر تھے۔مولانا نے اس موقع کے لیے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا، پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی اس لیے آخری حصہ چھوڑ دیا۔قیام گاہ پر واپس آکر

فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اچھا ہوا اندھیرا ہوگیا ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا اسی وقت پانی یا شربت حاضر کردیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔
جب کبھی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے، قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے۔ پیسہ اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خان کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر ان کی تعریف میں نظم لکھی، ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اورا س کا دوسرا پہلو سمجھاتے، ان خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں۔ جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے، ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آیندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔
ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کُرید کُرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بَری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزادؔ نے مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں اُن کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہ لکھا۔ آزادؔ مرحوم تو اُن کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔

برکھا رُت، حبِ وطن، نشاطِ امید اُسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزادؔ کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے ان کا رخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزادؔ اپنے رنگ کے بے مثل نثّار ہیں مگر شعر کے کوچہ میں اُن کا قدم نہیں اُٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزادؔ کے سر باندھتے ہیں۔

''۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزادؔ کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمنِ پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔''

بات میں بات نکل آتی ہے جب حیاتِ جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لیے جو اس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے۔'' وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سُن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کہنا سوءِ ادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیے۔ قیام حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خان مولانا سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خان صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ سُنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی

فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی گئیں، لیکن انہوں نے کبھی اس کا بُرا نہ مانا۔ مولانا حسرتؔ موہانی کا واقعہ جو مجھ سے مولوی سلیم نے بیان فرمایا اور اب شیخ اسمٰعیل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے بہت ہی پُر لطف ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی نے علی گڑھ سے ''اردوئے معلّٰی'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ ''اردوئے معلّٰی'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالیؔ بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ اِن مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور ''اردوئے معلّٰی' کے دو تین پرچے اٹھالائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالیؔ کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اردوئے معلّٰی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ! خوب لکھا کہہ کر داد دیتے تھے، حالیؔ بھی 'ہوں ہاں' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرتؔ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالیؔ سے بڑھ کر مخرّبِ زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالیؔ ذرا ملکدّر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا کہ ''حالیؔ کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟'' جواب دیا کہ ''جو کچھ لکھ چکا ہوں، اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''[1]

مولانا انگریز مطلق نہیں جانتے تھے ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم وتہذیب کے منشاء کو جیسا وہ سمجھتے تھے، اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دکھا دیا۔ آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے۔ بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی۔ ایسا شاذ ونادر ہوتا ہے۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے مطابق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں ایک تو انہوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا۔ جو اَب حالیؔ مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اورنٹیل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے انہوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ مناجاتِ بیوہ اور چپ کی داد یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان

[1] رسالہ زمانہ ماہِ دسمبر ۱۹۰۸ء جلد ۱۱، نمبر ۶، صفحہ: ۲۹۸ تا ۲۹۹۔ ماخوذ از تذکرۂ حالیؔ، صفحہ: ۱۹۵ تا ۱۹۸۔

میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں، ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوشِ ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں دل وجگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انہیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے، اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا۔ مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔ خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انہیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدر آباد میں ایک روز ''اولڈ بوائے'' آیا تو اُسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرا پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انہیں علی گڑھ کے طلباء سے اِس سے اعلیٰ توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تا کہ وہ نمونے کا کام دیں یہ گفتگو انہوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اُردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا، اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد پر ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب وہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے، پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے

گا۔کوئی مخلِ اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آ کر بہت خوش ہوں گے۔وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگران کے فرزند سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز واقارب رضامند نہ ہوئے۔عذر یہ تھا کہ دُور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے، طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلافِ مصلحت ہے۔مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ کر بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمہارے ساتھ ہولوں گا پھر کوئی چون وچرا نہیں کرے گا۔جب میں گیا تو بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ان کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔درگزر کا یہ عالم تھا کہ ان سے کیسی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔جب ملتے تو اسی شفقت وعنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس بدسلوکی اور بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔اِس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حُسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں، اُن کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں ورنہ یوں دنیا میں پند ونصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔اب بھی بہت سے صاحبِ علم وفضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں، مگر افسوس کہ کوئی حالیؔ نہیں!!

☼......☼......☼

آخری قسط

# علمائے ہند کا سیاسی موقف

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ

**تحریک شیخ الہند کا زمانہ:** ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ ہندوستان میں ایک بڑی بے چینی اور شدید اضطراب وشورش کا زمانہ ہے۔ ۱۹۰۵ء میں صوبہ بنگال کی تقسیم نے اس میں اور اس کے ملحقہ صوبوں میں نوجوانوں کی ایک دہشت پسند پارٹی پیدا کردی تھی جو تشدد کے ذریعہ ملک کو آزاد کرانا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۳۰/اپریل ۱۹۰۸ء کو مظفر پور[1] کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کنگسفورڈ پر بم پھینکا گیا جو اگرچہ ان کے نہیں لگا لیکن دو یورپین خواتین مس کینڈی اور مسز کینڈی اُس سے ہلاک ہوگئیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان دہشت پسند نوجوانوں کی سرگرمیاں پس پردہ (Underground) نہیں تھیں۔ ''جگنتر'' نامی ایک ہفتہ وار بنگالی اخبار نکلتا تھا جو صاف لفظوں میں دہشت انگیزی اور تشدد کی حمایت کرتا تھا اور بم کس طرح بنائے جاتے ہیں، اس کا فارمولا کھلم کھلا بتلایا جاتا تھا۔ اس تشدد پسند تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ سینکڑوں بنگالی نوجوانوں نے اپنی زندگیاں قربان کردیں، نہایت شدید قسم کی سزائیں برداشت کیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے ملک کو ہی خیرباد کہہ دیا۔ مثلاً، شیام جی کرشن ورما، مس کما داس۔ آر رانا، ساور کر برادرز، چٹو پادھیا، راش بہاری بوس وغیرہ ہم۔ ان لوگوں نے باہر کے ملکوں میں پھیل کر ہندوستان کی قومی تحریک کا پرچار کیا۔ اس کے علاوہ اس بات کی سازش کی گئی تھی کہ کناڈا سے گولہ بارود ہندوستان لایا

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ نے غالباً سبقت قلم سے مظفر پور کے بجائے مظفر نگر لکھ دیا ہے جو صوبہ یو۔ پی کا ایک ضلع ہے۔ (امرت بازار پتریکا آزادی نمبر، ص:۱۹)

جائے اور اس مقصد کے لیے ایک اسٹیمر لے بھی لیا گیا تھا لیکن اسے کناڈا کے ساحل پر اُترنے کی اجازت نہ مل سکی اور مجبوراً واپس آنا پڑا۔انہیں نوجوانوں میں سے کئی ایک سکھوں کو بج بج کے مقام پر گولی سے اُڑا دیا گیا۔

ایک طرف بنگال، بہار، اُڑیسہ اور آسام میں انقلاب پسند پارٹی کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا اور دوسری جانب پنجاب میں نوآبادیات کے بل نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔لالہ لاجپت رائے یہاں کے لیڈر تھے اس لیے ان کو جلاوطن کیا گیا اور راولپنڈی اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے بڑے بڑے معزز اور اونچے طبقہ کے لوگوں پر بغاوت کے مقدمات چلائے گئے ۔ یہ شورش پھر بھی کم نہ ہوئی تو ایک ہنگامی قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دیا گیا ۔۱۲؍ دسمبر ۱۹۱۱ء کو لارڈ ہارڈنگ پر جبکہ وہ ہاتھی پر بیٹھے ہوئے دہلی کے چاندنی چوک سے گذر رہے تھے، جو بم پھینکا گیا تھا وہ بھی ملک کے اسی اضطراب اور بے چینی کا ایک مظاہرہ تھا۔[1]

تشدد پسندی اور دہشت انگیزی کی اس تحریک کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اخلاقی اعتبار سے بلند پایہ لوگوں کی ایک اور جماعت تھی جو تعمیری پروگرام کے ذریعہ ملک کو اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتی تھی جس میں وہ ناگہانی طور پر گرفتار ہو گیا تھا۔اس جماعت کے سرخیل آر بندو گھوش، ڈاکٹر گروداس سبز جی اور بابو بین چندر پال تھے۔

ان کے تعمیری پروگرام کے عناصر اربعہ یہ چیزیں تھیں (۱) سودیشی کو رواج دیا جائے ۔(۲) بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ (۳) تعلیم کو قومی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے (۴) اور سوراج حاصل کیا جائے۔

---

[1] مولانا محمد میاں نے ''علمائے حق حصہ اوّل، ص:۱۱۷'' میں ۱۹۱۰ء لکھا ہے یہ صحیح نہیں ۔ کیونکہ یہ واقعہ تقسیم بنگال کی منسوخی کے سلسلہ میں پیش آیا تھا اور یہ اعلان ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔

سوراج کی تعریف ابراہام لنکن کے لفظوں میں یہ تھی کہ ''ملکوں کے باشندوں کی وہ سلطنت جو لوگ باشندوں کے ذریعہ سے کریں اور باشندوں کے لیے کریں''۔

کانگریس اس زمانہ میں ملک کی ترقی پسند جماعت ضرور تھی لیکن تاریخ کانگریس کے مصنف اور کانگریس کے حالیہ صدرِ منتخب ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیہ کے بقول وہ اب تک اعتدال پسند لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اور اس بنا پر ملک کے پُر جوش طبقہ میں عام طور پر اُس سے بیزاری پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں جب ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہونا طے پایا تو اس درجہ گڑ بڑ مچی کہ مجلس استقبالیہ کا جلسہ نہ ہو سکا، پھر سورت میں اجلاس ہونا قرار پایا جس کے لیے تھوڑی سی ہی مدت میں بڑی بڑی تیاریاں کی گئی تھیں لیکن ابھی مشکل سے خطبۂ صدارت شروع ہی ہوا تھا کہ ہنگامہ برپا ہو گیا اور جلسہ ملتوی کر دینا پڑا۔

ملک میں عام بے چینی اور اضطراب کو دیکھ کر انگریزوں نے جہاں ایک طرف حد سے زیادہ سختیاں کیں، لوگوں کو بڑی بڑی سزائیں دیں، ہنگامی قوانین نافذ کئے اور اپنی قوت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ سر چنتا منی ایسا لبرل اور ٹھنڈے مزاج کا اخبار نویس بھی اس کی شکایت ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

> ''گورنمنٹ نے شکایتیں دور کرنے کے بجائے سختی سے کام لینا اور اس کے ذریعہ سے شورش کو دبانا چاہا اور یہی ہر غیر ذمہ دار گورنمنٹ کا مذموم طرز و طریقہ رہا ہے۔ اس بات کو ہم تا زیست نہیں بھول سکتے۔ اس لئے کہ اُس وقت سے اِس وقت تک کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔''

(سیاسیات ہند مابعد غدر، ص:۷۵)

طاقت وقوت کے غیر معمولی مظاہرہ کے علاوہ حکومت نے اپنا وہ سب سے زیادہ موثر اور کارگر حربہ بھی استعمال کیا جس کو وہ اس ملک میں اپنے لئے سب سے بڑی پناہ گاہ سمجھتی تھی۔ یعنی مشرقی بنگال میں فرقہ وارانہ فساد کرا دیا۔ یہاں تک کہ ایک سیشن جج نے گواہوں کو دو طبقوں ہندو اور مسلمانوں میں تقسیم کر کے

مسلمانوں کی گواہی کو صرف اس بنا پر ترجیح دی کہ وہ مسلمان تھے۔علاوہ بریں ایک مقام پر بعض لوگوں سے اس بات کی منادی کرادی کہ گورنمنٹ نے ہندوؤں کو لوٹ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ایک دوسری جگہ جیسا کہ ایک مجسٹریٹ کے بیان سے ظاہر ہے یہ کہا گیا کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو ہندو بیوہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی۔''

(سیاسیات ہند مابعد غدر،ص:٦٧)

لیکن انگریزوں کی اس چال کا اس وقت کوئی اثر نہیں ہوا۔اور ملک میں حکومت وقت کے خلاف جو بیزاری پھیلی ہوئی تھی اور جس میں ہندو مسلمان سب ہی یکساں طور پر حصہ دار تھے۔اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سرڈنزل ابٹسبن کے بقول ''لوگ ہر جگہ کسی تبدیلی کا انتظار کررہے تھے اُن کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ حکومت کے خلاف ایک عام تحریک کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔''

بہر حال جلا وطنیوں،قید و بند اور ایک عام سیاسی بے چینی و اضطراب کا یہ دور تھا جس میں کہ شیخ الہند نے اپنی تحریک شروع کی۔

**تحریک کے دورُخ:** اس تحریک کے دو رُخ تھے ایک بیرون ہند انگریزوں کے خلاف پروپگینڈا اور مختلف ملکوں میں اپنے اپنے سفیر اور ایلچی بھیج کر بیرونی طاقتوں سے امداد لینا۔آپ ابھی پڑھ آئے ہیں کہ یہ وہی کام تھا جس کو عام ہندوستان اور خصوصاً بنگال کی ایک انقلاب پسند پارٹی انجام دے رہی تھی،اور اس تحریک کا دوسرا رُخ تھا یہاں کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا اور ان کو باہر سے پیدا ہونے والے انقلاب کی مدد کرنے کے لیے تیار کرنا۔اس سلسلہ میں عوام سے ربط

اور مسلمان اربابِ فکر واثر سے تعلق پیدا کرنا اوران کو اپنا ہم آہنگ بنانا ضروری تھا اس مقصد کے لئے ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک نہایت عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ملک کے گوشہ گوشہ سے مسلمان جوق در جوق شریک ہوئے۔ پھراس جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دیوبند اور علی گڑھ میں جو دوری چلی آرہی تھی وہ دور ہوگئی۔ علی گڑھ کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے بڑے شوق وذوق سے جلسہ میں شرکت کی۔ اس کی تمام کارروائیوں میں دلچسپی لی اور اپنی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ ہر سال دیوبند کے فارغ التحصیل طلباء کی ایک خاص تعداد علی گڑھ آکر انگریزی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم حاصل کرے اور اسی طرح علی گڑھ کے گریجویٹ طالب علم دیوبند آکر عربی اور علوم دینیہ کی تحصیل کریں۔ اس جلسہ نے تمام ملک میں دارالعلوم دیوبند کی عظمت اور اس کے کام کی اہمیت وضرورت کا ایک عام اعتراف پیدا کر دیا اور اس طرح جو جماعت کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اب تک اپنے ایک خاص دائرہ میں خاموشی کے ساتھ کام کر رہی تھی وہ پبلک میں روشناس ہوگئی اور ہر گوشہ کے مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس کے بعد جمعیۃ الانصار نامی ایک انجمن جس کا مقصد عوام سے ربط (Mass Contact) پیدا کرنا تھا اس کا اجلاس ۱۹۱۱ء میں مراد آباد میں ہوا۔ اور لوگوں نے اس میں بھی بڑے شوق سے شرکت کی۔

علاوہ بریں خواص سے ربط قائم کرنے اوران کو وحدتِ فکر کے ایک رشتہ میں منسلک کرنے کی غرض سے ایک انجمن نظارۃ المعارف کے نام سے قائم کی گئی، ہندوستان کے مشہور انقلابی لیڈر مولانا عبیداللہ سندھی اپنے استاذ حضرت شیخ الہند کے حکم اوران کے زیر ہدایت ونگرانی ان دونوں انجمنوں کے اصل روح رواں اور بڑے سرگرم کارکن تھے۔ اس انجمن کا مقصد کیا تھا؟ اور کس طرح اس میں قدیم وجدید دونوں قسم کے نمایاں اور ممتاز تعلیم یافتہ حضرات ایک دوسرے کے ساتھ گھُ بیٹھ گئے تھے؟ اس کا اندازہ

مولانا سندھی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

''حضرت شیخ الہند کے حکم سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا، ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ العارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم محمد اجمل خاں صاحب اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کے لیے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔''

(خطبات مولانا سندھی، ص:۶۷)

مولانا نے اس بیان میں جو نام گنائے ہیں ان میں سے ڈاکٹر انصاری مرحوم تو (جو کانگرس کے صدر اور تحریک آزادی کے ایک نامور جنرل تھے) با قاعدہ حضرت شیخ الہند کے نہایت جاں نثار وفادار مرید تھے، ان کی بیوی بھی حضرت شیخ سے بیعت تھیں اور اسی تعلق کا یہ اثر ہے کہ حضرت شیخ کے گھرانہ اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خاندان میں اب تک وہ ہی محبت وخلوص اور احترام وعقیدت کے تعلقات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ مولانا محمد علی اور شوکت علی اگرچہ با قاعدہ بیعت نہ تھے لیکن مثل مرید کے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر شیخ الہند کی وفات کے وقت محمد علی جس طرح بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے ہیں اور دیوانہ وار جنازے کے ساتھ ساتھ یہ کہتے ہوئے گئے ہیں کہ ''آج ہماری کمر ٹوٹ گئی'' آج بھی بہت سے لوگوں کے دلوں میں اس زہرہ گداز منظر کی یاد تازہ ہوگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس زمانہ میں سب سے کم عمر تھے اسی بنا پر ان میں اور شیخ الہند میں وہی تعلق تھا جو اُستاد

شاگرد میں یا باپ بیٹے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ لارڈ مسٹن گورنر یوپی کے دارالعلوم دیوبند میں آنے کے دن مولانا آزاد دیوبند میں ہی تھے۔ حضرت شیخ الہند نے اس اجتماع میں شرکت نہیں فرمائی تھی جو گورنر صاحب کے اعزاز میں مدرسہ کے اندر ہوا تھا۔ اور مولانا آزاد کو بھی اس میں بازیابی کی اجازت نہ تھی۔ اس بنا پر شیخ الہند دن بھر مولانا آزاد کو لئے ہوئے اپنے مکان پر بیٹھے رہے۔

مذکورۂ بالا حضرات اور دارالعلوم دیوبند کے توسل سے حضرت شیخ الہند کے خاص خاص شاگردوں کے علاوہ ہندوستان کے اور مقتدر اصحاب بھی تھے جو شیخ الہند کی سیاسی تحریک سے وابستہ تھے ان میں سب سے نمایاں نام خان عبدالغفار خان کا ہے، خان صاحب اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں حضرت شیخ سے اپنے تعلق اور ان کے معتمد علیہ ہونے کا ذکر بڑے مزے سے کرتے ہیں۔ اور تین چار سال ہوئے جب کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں تقریر کی تھی اس میں اعلانیہ طور پر اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ علماء کی اس جماعت سے تعلق رکھنے کا ہی یہ اثر ہے کہ وہ ایک طرف سیاسی اعتبار سے صوبہ سرحد کے گاندھی ہیں اور دوسری جانب نماز روزہ اور قرآن مجید کی تلاوت کے بڑے پابند ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی یہ سرگرمیاں تو وہ تھیں جو منظر عام پر تھیں۔ ان کے علاوہ آپ کی جو خفیہ سرگرمیاں تھیں ان کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ آپ ایسے لوگوں کی جماعت تیار کر رہے تھے جو ہندوستان میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے وقت آنے پر اپنی جان کی بازی بھی لگا سکیں اور اس مقصد کے لئے آپ لوگوں سے بیعت لے رہے تھے، ڈابھیل ضلع سورت کے ایک بزرگ جو وہاں کے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں انہوں نے خود ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ اُن بیعت کرنے والوں میں سے ایک میں بھی تھا، مولانا سید محمد میاں نے بھی علمائے حق حصہ اوّل میں اس کا ذکر کیا ہے اور دہلی کی مشہور تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک کتاب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے بھی بیعت کی تھی۔

پھر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ اس تحریک کا مقصد ملک کو غیر ملکی حکومت سے نجات دلا کر ایک جمہوری

حکومت قائم کرنا تھا اس بناء پر یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ شیخ الہند نے راجہ مہندر پرتاب اور ان کی پارٹی سے بھی رابطہ پیدا کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں مولانا سندھی نے افغانستان پہنچ کر کانگریس کی شاخ قائم کی اور ہندو اور سکھوں کو بھی ساتھ ملا کر کام کیا! غرض یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کی غرض سے ایک عوامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو مختلف پارٹیاں کام کر رہی تھیں حضرت شیخ الہند کی پارٹی ان سب میں پیش پیش تھی۔ اس پارٹی میں انگریزی تعلیم یافتہ، علماء، ہندو اور مسلمان سب یکساں شریک تھے۔ ہمارا یہ دعویٰ اس پارٹی کے ساتھ محض خوش اعتقادی یا اس کی بالاخوانی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف صاف لفظوں میں ملک کے محبوب لیڈر اور سابق صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:۔

> ''اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ لوگوں میں جوش اور اشتعال پیدا ہوگیا تھا اور بعض لوگوں نے جن میں مسلمان پیش پیش تھے۔ بہت جرأت آموز تجویزیں آزاد ہندوستانی جمہوریت کے قیام کے لئے بنائیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، اور اُن کے ساتھی مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، اور مولانا حسرت موہانی سب اس لیے نظر بند کر دئے گئے کہ ان کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں اور ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں جرمنوں کے ساتھ شریک ہوگئے تھے۔ ان مولاناؤں کی خطا یہ بھی تھی کہ وہ علی الاعلان متحدہ قومیت کا راگ الاپا کرتے تھے۔''

(ہندوستان کا مستقبل، اردو ترجمہ، ص: ۲۳۵)

**شیخ الہند کا سفرِ حجاز:** اب رہا اس تحریک کا دوسرا رخ یعنی بیرون ہند اس تحریک کا پروپیگنڈہ کرنا تو اس سلسلہ میں پہلے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجا گیا اور پھر خود حضرت شیخ الہند جنگ عظیم اوّل کے پہلے سال میں حجاز کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں بہت سے حضرات آپ کے ساتھ ہو گئے تھے ان میں مولانا محمد میاں، منصور انصاری (مولانا حامد الانصاری غازی ایڈیٹر ''مدینہ'' کے والد ماجد) مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بھتیجے مولوی وحید احمد اور مولانا عزیر گل خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ ۲۸؍ ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کی شام کو مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے۔

**حجاز میں حضرت شیخ کی سرگرمیاں:** اس زمانہ[1] میں مکہ کے گورنر غالب پاشا تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ان سے ملاقات کی اور اپنی تجویز پیش فرما کر امداد کا مطالبہ کیا۔ غالب پاشا پہلے سے آپ سے متعارف تھے۔ انہوں نے آپ کو چند خطوط دیئے۔ جن میں سے ایک خط مدینہ کے گورنر بصری پاشا کے نام تھا اور اس میں لکھا تھا کہ حضرت شیخ الہند کو انور پاشا اور جمال پاشا سے ملا دیا جائے۔ اس کے علاوہ استنبول وغیرہ کے حکام اور دیگر ارکان حکومت کے نام بھی غالب پاشا نے خطوط لکھ کر حضرت شیخ کو دئے تھے، شیخ الہند ان خطوط کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے، بصری پاشا کو ان کے نام خط دیا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں میں کسی جنگی ضرورت سے انور پاشا اور جمال پاشا دونوں مدینہ طیبہ آگئے۔ شیخ الہند نے دونوں سے ملاقات کی، اپنی اسکیم اُن کے سامنے پیش کی اور بتایا کہ وہ کس طرح اس کے کامیاب کرنے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ انور پاشا نے یہ اسکیم سن کر اس کو پسند کیا۔ اپنی ہمدردی ظاہر کی، امداد کا وعدہ فرمایا۔ اور چند وثیقے تحریر فرما کر آپ کے سپرد کئے جن

[1] اس عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اگرچہ اپنے اساتذہ سے اور دوسرے اصحاب سے میں نے بارہا سنا ہے۔ لیکن اس کو ''علمائے حق'' حصہ اوّل سے ماخوذ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے علاوہ میرے علم میں ان واقعات کا کوئی اور تحریری سرمایہ موجود نہیں۔

کا تعلق قبائل آزاد اور افغانستان سے تھا۔ انور پاشا کی رائے تھی کہ شیخ الہند خود بخود بنفس نفیس آزاد قبائل میں پہنچیں اور وہاں اپنا کام شروع کریں۔ حضرت شیخ نے بحری راستہ سے سفر کرنے کے بجائے خشکی کے راستہ سے سفر کرنا چاہا لیکن چونکہ ایران میں انگریزی فوجیں پڑی ہوئی تھیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ اس لئے انور پاشا کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ براہ بغداد بحری سفر کر کے بلوچستان اور وہاں سے آزاد قبائل میں پہنچیں۔ یہ واقعات پڑھتے وقت اپنے ذہن میں یہ بھی رکھئے کہ حضرت کی پیدائش ۱۲۶۸ھ کی ہے۔ اس حساب سے آپ کی عمر اس وقت ستر کے لگ بھگ تھی۔ لیکن حوصلہ، ولولہ اور ایک مقصد عظیم کے لیے بے چینی و بے تابی کا یہ عالم ہے کہ ضعیف العمری کے مقتضیات کی کوئی پرواہ نہیں اور اس قدر مشکل اور پُر از صعوبت سفر اور کام کے منصوبے بن رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ کسی طرح انور پاشا کے لکھے ہوئے وثیقے خود شیخ الہند کے پہنچنے سے قبل قبائل آزاد میں پہنچا دیئے جائیں اس مقصد کے لیے مولوی ہادی حسن صاحب کو منتخب کیا گیا[1]۔ اور وثیقوں کو محفوظ کرنے کی صورت یہ کی گئی کہ ایک صندوق کی دیوار کے تختوں میں سوراخ کر کے وثیقہ اس کے اندر رکھ کر تختہ کو دونوں طرف سے ہموار کر دیا گیا۔

مولوی ہادی حسن صاحب بمبئی پہنچے۔ انگریزی جاسوسوں نے پہلے سے حکومت کو اطلاع کر دی تھی۔ بمبئی کے ساحل پر بڑی سختی کے ساتھ مولوی صاحب کے سامان اور کپڑوں کی تلاشی لی گئی۔ مگر کوئی چیز نہ ملی۔ مولوی صاحب نے مکان پہنچ کر وثیقہ صندوق کے کواڑوں سے نکال کر اپنی بنڈی (واسکوٹ) میں رکھ لیا۔ پولیس کو پھر وثیقہ کی نسبت کن بھن پہنچی تو مولوی صاحب کے جائے قیام پر چھاپا مارا تمام بکسوں

---

[1] مولوی ہادی حسن صاحب جہانپور ضلع مظفر نگر کے رؤسا میں سے ہیں۔ نہایت مخلص، مومن قانت اور راست باز بزرگ ہیں۔ جب کبھی اپنی سفارت اور اس سلسلہ کے پیش آمدہ واقعات سناتے ہیں تو فرط جوش سے آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ کَثَّرَ اللّٰہُ امثالہٗ۔

کی تلاشی لی۔ کپڑے جو اُن میں رکھے ہوئے تھے انہیں اُلٹ پلٹ کر کے اور جھاڑ ٹپک کر دیکھا۔ پھر اس پر بھی نہ پتہ چلا تو بکسوں کو توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ حسن اتفاق سے یہ بنڈی اس وقت سامنے کواڑ پر ہی ٹنگ رہی تھی اس کی طرف اُن کا ذہن منتقل ہی نہ ہو سکا آخرام مایوس و ناکام لوٹ گئے۔ اور وثیقہ کو جہاں جانا تھا وہاں پہنچا دیا گیا۔

**شیخ الہند کی اسارت:** وثیقہ روانہ کرنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے خود اپنے سفر کا ارادہ کیا۔ تجویز یہ تھی کہ غالب پاشا گورنر مکہ سے مل کر استنبول جانے کی راہ پیدا کریں۔ چنانچہ آپ مکہ معظّمہ آئے یہاں معلوم ہوا کہ غالب پاشا طائف میں مقیم ہیں تو وہاں پہنچے، سب معاملات طے ہو گئے اور آپ نے مکہ معظّمہ واپس ہو کر استنبول جانے کی تیاری شروع کر دی لیکن نیرنگیِ روزگار سے یہاں یہ ہوا کہ شریف حسین نے انگریزوں سے ساز باز کر کے یک بیک ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس بغاوت کے باعث عالم اسلام میں عموماً ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں میں عربوں کی طرف سے بیزاری اور بددلی پیدا ہوئی تو انگریزوں نے ایک استفتاء مرتب کرایا اور جو علماء شریف حسین کے زیر اثر تھے ان سے اس کا جواب لکھوایا جس میں کھلے لفظوں میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی۔ سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا۔ اور شریف حسین کی بغاوت حق بجانب اور مستحسن قرار دی گئی تھی۔ یہ استفتاء اور جواب حضرت شیخ الہند کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا اور آپ پر زور ڈالا گیا کہ اس پر اپنی تصدیق ثبت کر دیں۔ لیکن آپ نے صاف لفظوں میں بڑی سختی کے ساتھ اس پر دستخط کرنے سے انکار فرمایا۔ انگریز پہلے سے یہ جانتے ہی تھے۔ اب انہوں نے شریف حسین پر زور ڈال کر آپ کو مع آپ کے رفقاء کے گرفتار کر لیا اور جہاز پر بٹھا کر مالٹا لے جا کر نظر بند کر دیا۔ افسوس! ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔

جدہ سے مالٹا پہنچے اور وہاں نظر بند ہونے تک درمیان میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے بہت سے

واقعات سبق آموز بھی ہیں اور ولولہ انگیز بھی، عبرت انگیز بھی ہیں، اور حیرت خیز بھی۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ''سفرنامۂ اسیر مالٹا'' میں ان کو بہ تفصیل لکھا ہے چونکہ ہمارے موضوع گفتگو سے اُن کا تعلق نہیں ہے اس بنا پر ان کا تذکرہ ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔ البتہ اسیران مالٹا کے جرائم کی تحقیق و تفشیش کے سلسلہ میں بمقام جزیرہ (مصر) حضرت شیخ الہند سے متعلق تمام اطلاعات اور معلومات ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کی بھیجی ہوئی موجود تھیں جو سوالات و جوابات ہوئے، ہم ذیل میں اُن کو ''سفرنامہ اسیر مالٹا'' سے نقل کرتے ہیں۔ ایک ذہین قاری ان کو پڑھ کر پورے طور پر اندازہ کرسکتا ہے کہ شیخ الہند کیا تھے؟ ستر برس کی عمر میں بھی اُن کا حوصلہ مندی اور عالی ہمتی کا کیا عالم تھا، پھر اس سوال و جواب میں آپ کو بعض ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو ایک سچے مسلمان انقلابی کو دوسرے قسم کے انقلابیوں سے ممتاز کردیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

س: آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا؟ ج: اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر

س: آپ نے دستخط کیوں نہ کیے؟ ج: خلاف شریعت تھا۔

س: پھر آپ نے کیا کیا؟ ج: رد کردیا۔

س: کیوں؟ ج: خلاف شرع تھا۔

س: آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں؟ ج: ہاں۔ انہوں نے دیوبند میں عرصۂ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے۔

س: وہ اب کہاں ہیں؟ ج: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں۔

س: ریشمی خط کی حقیقت کیا ہے؟ ج: مجھے کچھ علم نہیں نہ میں نے دیکھا ہے۔

س: وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں اور آپ فوجی ج: اگر وہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کمانڈر، میری جسمانی حالت ملاحظہ

کمانڈر رہیں۔؟

فرمائیے اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے میں نے تمام عمر مدرسے میں گزاری مجھ کو فنونِ جنگ اور فوجی کمان سے کیا تعلق؟

س: مولوی عبیداللہ سندھی نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟

ج: مدرسہ کے مفاد کے لیے۔

س: پھر وہ کیوں علیٰحدہ کیا گیا؟

ج: آپس میں پھوٹ پڑ جانے کی وجہ سے۔

س: کیا اس کا اس جمعیت سے مقصد کوئی سیاسی امر نہیں تھا؟

ج: نہیں۔

س: غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟

ج: غالب نامہ کیسا؟

س: غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے اس کو غالب پاشا سے حاصل کیا ہے؟

ج: مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا، مدینہ منورہ سے وہ مجھ سے جدا ہوا ہے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مدینہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں۔

س: محمد میاں کے پاس۔ حضرت شیخ الہند نے پھر دریافت کیا کہ مولوی محمد میاں کہاں ہیں؟

ج: انگریز افسر نے کہا ''وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں پہنچ گیا ہے۔ حضرت شیخ: پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا؟ جواب دیا گیا کہ لوگوں نے دیکھا۔ اب حضرت نے فرمایا۔ آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی۔ میرا وہاں کیسے گزر ہوسکتا ہے۔ پھر میں ایک ناواقف شخص! نہ ترکی زبان جانتا ہوں اور نہ ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط۔

س: آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی؟

ج: بیشک کی۔

س: کیوں کر؟

ج: وہ مدینہ میں ایک دن کے لیے آئے تھے تو صبح کے وقت انہوں نے مسجد میں علماء کا مجمع کیا۔مولوی حسین احمد صاحب اور وہاں کے مفتی مجھ کو بھی اس مجمع میں لے گئے اور اختتام مجمع پر ان دونوں وزیروں سے مجھ کو ملا دیا۔

س: انور پاشا نے آپ کو کچھ دیا؟

ج: اتنا ہوا ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لے کر انور پاشا کی طرف سے آیا تھا۔

س: پھر آپ نے ان کا کیا کیا؟

ج: مولوی حسین احمد صاحب کو دے دیئے تھے۔

س: ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ترکی، ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کر ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

ج: حضرت شیخ نے جواب دیا مجھے سخت تعجب ہے کہ اتنے دن آپ کو حکومت کرتے ہوگئے۔مگر یہ بات آپ کو سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے جیسا گمنام شخص اتنے بڑے کام کا ذمہ کیسے لے سکتا ہے؟ ان تینوں ملکوں میں سالہا سال کی جو عداوتیں ہیں کیا میں ان کو دور کر کے انہیں متحد کر سکتا ہوں اور اگر وہ متحد ہو بھی جائیں تو ان کے پاس اتنی فوجیں کہاں ہیں کہ ملکی ضرورتوں کو بھی پورا کریں اور ہندوستان پر بھی حملہ کر دیں اور اچھا! اگر انہوں نے حملہ کر بھی دیا تو کیا وہ آپ کی زبردست طاقت سے جنگ کر سکیں گی! اس پر وہ انگریز بولا کہ ''فرماتے تو آپ سچ ہیں۔مگر ان کاغذات میں ایسا لکھا ہے''۔اس کے بعد پوچھا گیا کہ ''شریف حسین کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے'' آپ نے فرمایا ''وہ باغی ہے''۔

اس موقع پر اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ عربوں نے انگریز کے بہکائے میں آکر ترکوں سے جو بغاوت کی تھی (اور قدرت کی طرف سے جس کی سزا آج وہ بھگت رہے ہیں اور جس نے ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی طاقت کو بکھیر کر رکھ دیا۔) حضرت شیخ الہند نے اس دردناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خود بھی اس کا شکار ہوئے تھے اس بنا پر آپ کو عربوں سے اس قدر نفرت ہوگئی تھی کہ مالٹا سے ہندوستان آنے کے بعد آپ ایک مرتبہ مراد آباد تشریف لائے اور یہاں مسلمان رضا کاروں کی ایک جماعت کو عربی لباس میں دیکھا تو آپ نے کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا ''یہ غداروں کا لباس ہے اس کو اُتار دو''

(علمائے حق، حصہ اول، ص:۱۷۱)

چونکہ حکومت کو تحریک کی سرگرمیوں کی نسبت تمام اطلاعات اور معلومات پہنچ چکی تھیں اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے زمانہ میں کسی باغی شخص یا گروہ کی سزا موت سے کم نہیں ہوتی اس بنا پر حضرت شیخ الہند کے تمام ساتھیوں اور دوسرے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر اس کا یقین تھا کہ سب لوگوں کو پھانسی دے دی جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت شیخ بالکل مطمئن اور پُرسکون تھے اور اپنے رفقاء کی دلدہی اور دل جوئی کی برابر سعی فرماتے رہتے تھے لیکن یہ دلجوئی محض بر بناء شفقت بزرگانہ و مربیانہ تھی ورنہ جو جان نثار آپ کے ساتھ تھے ان میں سے ایک ایک کے عزم و استقلال کا یہ عالم تھا کہ زبان حال سے کہہ رہا تھا۔

ے نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تختہ دار نظروں کے سامنے تھا۔ لیکن کیا مجال کہ دل میں ذرا بھی تشویش و اضطراب ہو، ایک مقصد اعلیٰ کے لیے جان دینا تو عین حیات ہے۔ زندگی اس سے اجڑتی نہیں بن جاتی ہے۔ بجائے فانی ہونے کے لافانی ہو جاتی ہے۔

ے یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر بوالہوس کے واسطے دارورسن کہاں!

مولانا مدنی اس وقت کے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے تاثرات واحساسات کو ان جرأت آموز الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''ہم قسمیہ کہہ سکتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم نئے پھنسے تھے، کبھی ایسے احوال ہم پر نہ گذرے تھے، نوعمر تھے، اپنے تمام رشتہ داروں اور بھائی بندوں سے الگ تھے، مگر اس کے باوجود نہ کسی چھوٹے کو نہ کسی بڑے کو کوئی اضطراب وقلق تھا اور نہ جزع وفزع۔ یہ سب تو درکنار، دل میں ذرا سی گھبراہٹ بھی نہ تھی اور نہ گھر کے کسی عزیز وقریب کی یاد ستاتی تھی۔ حالانکہ ہم سب کو یقین یا ظن غالب تھا کہ پھانسی ہوگی۔ مولوی عزیز گل صاحب تو اپنی کوٹھڑی میں رہ کر اپنی گردن اور گلے کو پھانسی کے لیے ناپتے اور دباتے تاکہ ذرا عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت اچانک تکلیف سخت پیش نہ آئے اور تجربہ کرتے تھے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر سب کے دل نہایت مطمئن تھے۔ گویا کہ اپنی نانی کے گھر میں آرام کر رہے ہیں۔ کبھی یہ وہم بھی نہیں گذرتا کہ کاش ہم مولانا کے ساتھ نہ ہوتے یا کاش ہم اس کام یا خیال میں شریک نہ ہوتے''۔

(سفرنامہ اسیر مالٹا، ص:۸۸-۸۹)

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقا کے بیانات کے بعد سب کو بتاریخ ۱۵ر فروری ۱۹۱۷ء مالٹا روانہ کر دیا گیا جو سیاسی اور جنگی قیدیوں کا سب سے بڑا اسارت گاہ تھا اور جہاں صرف وہ فوجی افسر یا سیاسی قید رکھے جاتے تھے جو بہت خطرناک اور اپنے خیالات میں حد درجہ مستقل اور پختہ کار سمجھے جاتے تھے۔

تین سال کے بعد اسیران مالٹا کی رہائی ہوئی اور اب تحریک نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

**آزادی کے لیے آئینی جدوجہد:** شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ تحریک شیخ الہند کے دو رُخ تھے ایک غیر آئینی اور دوسرا آئینی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا یہ اس تحریک کا غیر آئینی رُخ تھا اس کی روئداد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنگِ عظیم اوّل سے قبل ملک میں جو سیاسی حالات پیدا ہو گئے تھے یہ تحریک ان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ تھی۔ استخلاصِ وطن کے لیے جہاں ترقی پسند ہندو اور سکھ انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور باہر کے ملکوں سے ساز باز کر رہے تھے وہاں مسلمان بھی وقت کے اس مطالبہ سے غافل نہیں تھے بلکہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے بقول اُن کا قدم آگے آگے تھا۔

جنگ عظیم کے اختتام پر جب ترکی اور جرمنی کو شکست ہوئی اور انگریزوں کی بین الاقوامی طاقت پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی اور انقلابی سرگرمیوں کو دبانے اور فنا کرنے کے لیے ملک کی برطانوی حکومت نے ہنگامی قوانین اور بے دردی کے ساتھ ان کا استعمال کر کے ملک میں عام طور پر مایوسی اور ناکامی کے احساسات پیدا کر دیئے تو اب ضروری تھا کہ ان غیر دستوری سرگرمیوں کو ترک کر کے استخلاصِ وطن کے لیے کوئی تعمیری پروگرام بنایا جائے۔ اس زمانہ میں کانگریس کی طرف سے ہوم رول کی تحریک شروع ہوئی جو ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک چلتی رہی، کانگریس کا یہی دور ہے جس میں کہ گاندھی جی ہندوستان کی سیاسیات کے نقشہ میں نمایاں طور پر آئے اور عدم تشدد کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی کے دست راست تھے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں بمبئی میں ایک ستیہ گرہ سبھا قائم ہوئی اور اس کے لیے رولٹ (Rowlatt) ایکٹ کو پہلا نشانہ بنایا گیا۔ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھاتے تھے ان سے وعدہ لیا جاتا تھا کہ وہ اس ایکٹ کی مخالفت کریں گے اور ان قوانین کی بھی خلاف ورزی کریں گے جو کمیٹی وقتاً فوقتاً ان کو بتائے گی۔ اس تحریک کا ایک عام

اثر یہ ہوا کہ خفیہ سوسائٹی بنا کر جو کام کیے جا رہے تھے وہ بند ہو گئے اور اب لوگ کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کرنے لگے۔ اس تحریک نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔ ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ لوگ سول نافرمانی کرتے تھے، حکومت گرفتاریاں کرتی تھی۔ پولیس لاٹھیاں برساتی تھی لیکن عوام کا جوش تھا کہ کم نہ ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد پنجاب میں مارشل لاء نافذ کیا گیا تو اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ملک کی تمام ترقی پسند طاقتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔

مسلم لیگ بھی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں اس کا جلسہ دہلی کانگریس کے جلسہ کے ساتھ ہوا تو مولانا عبدالباری، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہم علماء نے بھی شرکت کی اور نمایاں حصہ لیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر استقبالیہ تھے، گورنمنٹ نے ان کا خطبہ ضبط کر لیا تھا۔ پُرامن اور آئینی سیاست کے پلیٹ فارم پر علماء کا یہ پہلا اجتماع تھا۔

**جمعیۃ علماء کا قیام:** ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک شروع ہوئی اور اگرچہ یہ مسلمانوں کی خالص مذہبی تحریک تھی لیکن چونکہ مسلمان ملک کی جدوجہدِ آزادی میں علماء کے زیر قیادت، اپنے برادران وطن کے دوش بدوش تھے، اس بناء پر ہندوؤں نے ادائے حق کے طور پر خلافت تحریک میں مسلمانوں کا پورا ساتھ دیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ پورا ملک فرقہ وارانہ اتحاد و یک جہتی کی خوشگوار فضا سے معمور ہو گیا۔ اسی سال علماء نے اپنی ایک جمعیت الگ قائم کی اس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی زیرِ صدارت امرتسر میں ہوا۔ دوسرا اجلاس ۱۹/۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوا۔ اب حضرت شیخ الہند ہندوستان آ چکے تھے اس لیے آپ ہی صدر منتخب ہوئے۔ یہ اجلاس نہایت عظیم الشان تھا یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ ہندوستان کے اطراف واکناف سے تمام علمائے دیوبند، علمائے ندوہ، علمائے فرنگی محل،

مقلد، غیر مقلد، بدعتی اور وہابی سب اور اُن کے ساتھ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے نمایاں حضرات، نمایاں ارباب فکر واصحابِ قلم ایک دوسرے کے ساتھ سر اور دل جوڑ کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ اسی جلسہ میں پانچ سو علمائے کرام کے دستخطوں سے ''ترک موالات'' کا متفقہ فتویٰ شائع ہوا۔ یہ فتویٰ خود حضرت شیخ الہند کا لکھا ہوا تھا اور دوسرے علماء نے اس پر تصدیقی دستخط کیے تھے۔ فتویٰ میں جن امور کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ یہ ہیں:۔

(1) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کیا جائے۔

(2) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار۔

(3) صرف اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ۔

(4) سرکاری سکولوں، کالجوں میں بچوں کو تعلیم نہ دی جائے۔

(5) جن امور میں فساد یا نقصِ امن کا اندیشہ ہو ان سے بالکل اجتناب۔

اس فتویٰ کے شروع میں حضرت شیخ الہند نے جو چند تعارفی سطریں لکھی ہیں ان میں یہ عبارت سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے:

> ''علمائے ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض، شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک جرم ہے''۔

(فتویٰ ترک موالات)

علاوہ بریں آپ کی آخری تحریر جو اس جلسہ میں پڑھ کر سنائی گئی، اس کے یہ الفاظ بھی خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

''میں دونوں قوموں کے اتحاد اور اتفاق کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائدنے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہو گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چوتھی قوم، خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست کر سکے گی''۔

**(ماہنامہ ''برہان'' دہلی نومبر 1948)**

نوٹ: ''علمائے ہند کا سیاسی موٴقف''، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، تاریخی اور تحقیقی قلم سے ماہنامہ ''برہان'' کی چار اقساط میں شائع ہوا جو اس مقام پر پہنچ کر ختم ہو گیا، مکمل نہیں ہوا۔
لیکن اس کے بعد زندگی کے ہنگاموں، وقت کے مسائل وافکار اور پیہم حوادث وواقعات نے ایسا ہجوم کیا اور انہیں اس طرح گھیرے رکھا کہ بعد کی اڑتیس سالہ مدت حیات میں بھی انہیں اس کے مکمل کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ان کے قلم سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔
اگر اس علمی اور تاریخی شہ پارے کا اختتام بھی انہی کے قلم سے ہو جاتا تو کیا ہی خوب ہوتا، لیکن۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد!

☼......☼......☼

# آرزُو

**شورش کاشمیری**

اگرامُ القریٰ میں خالقِ کونین نے شوؔرش
بہ عہدِ احمدِ مُرسلؐ مجھے پیدا کیا ہوتا

حِرؔا کی خاک میں تحلیل میرے جسم وجاں ہوتے
مری لوح جبیں پر آپؐ ہی کا نقش پا ہوتا

قدومِ سرورِ کونینؐ کی عظمت بحمد اللہ
میں خاکِ رہگذر ہوتا تو پھر بھی کیمیا ہوتا

دماغ و دل چمک اُٹھتے رُخِ پُر نور کی ضَو سے
نظر اٹھتی جہاں تک جلوۂ خیرالوریٰ ہوتا

بہر عنوان اُس ذاتِ گرامی پر نظر رہتی
کبھی اُن پر کبھی ان کے غلاموں پر فدا ہوتا

رسول اللہؐ کے ادنیٰ غلاموں کی ثنا لکھتا
کلام اللہ کے الفاظ میں نغمہ سرا ہوتا

شہنشاہوں کے تخت و تاج میرے پاؤں میں ہوتے
مِرا سَر سَید الکونینؐ کے دَر پر جُھکا ہوتا

خداوندانِ دولت کے گریبان پھاڑ دیتا میں
محمدؐ کی قسم قرآں کے پرچم گاڑ دیتا میں